1/-

ماہنامہ

شاہد

ادبی ڈائجسٹ

مدیر : محمود احمد ہنر

چند قلم نواز

جوش ملیح آبادی	اپندر ناتھ اشک	فیض احمد فیض	بلونت سنگھ
مخدوم محی الدین	جوگندر پال	احمد ندیم قاسمی	اوم پرکاش بجاج
سردار جعفری	رضیہ سجاد ظہیر	شاذ تمکنت	فضا ابن فیضی
مظفر حنفی	وقار احمد رضوی	نازش پرتاپگڑھی	بشریٰ نجم



اُردو کے معیاری ادبی رسائل کا انتخاب

شاہکار

نمبر ۵۳

مجلس مشاورت

سید احتشام حسین
خواجہ احمد عباس
مہندر ناتھ
خلیل الرحمن اعظمی
مظفر شاہجہانپوری
جیلانی بانو

مدیر ـــ
محمود احمد ہنر

قیمت
ایک روپیہ

سالانہ
دس روپے

نومبر ۱۹۶۷ء

دفتر شاہکار، ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

بمبئی آفس ـــ ڈائمنڈ لاج، سکندر پیر خاں اسٹریٹ بمبئی ۸۔ فون نمبر

ترتیب

ڈرامہ

غزلیں

مضامین

تبصرے

محمود احمد ہنرؔ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل آرٹ پرنٹرس میں چھپوا کر دفتر رسالہ "شاہکار"
۱۳۴۔ بخشی بازار۔ الہ آباد سے شایع کیا

اپنی بات

"شاہکار" میں قارئین کے خطوط شایع نہیں کیئے جاتے اور اتنی زیادہ تعداد میں موصول ہوتے ہیں کہ ہر خط کا جواب نہیں دیا جاسکتا، لیکن ہم ایک ایک خط کو پوری دلچسپی سے پڑھتے ہیں خواہ اُن میں ہماری تعریف ہو یا ہمیں اپنی غلطیوں پر ٹوکا گیا ہو۔ یہ ہم اس لیئے عرض کر رہے ہیں کہ اگر کسی صاحب کو ہمارا جواب نہ ملے تو وہ نہ دل برداشتہ ہوں، نہ یہ سوچیں کہ اُن کے مشوروں پر غور نہ کیا جائے گا یا ہم اپنی غلطی کی اصلاح نہ کریں گے۔ ہاں، دفتری اُمور سے متعلق ہر خط کا فوراً جواب دیا جائے گا۔

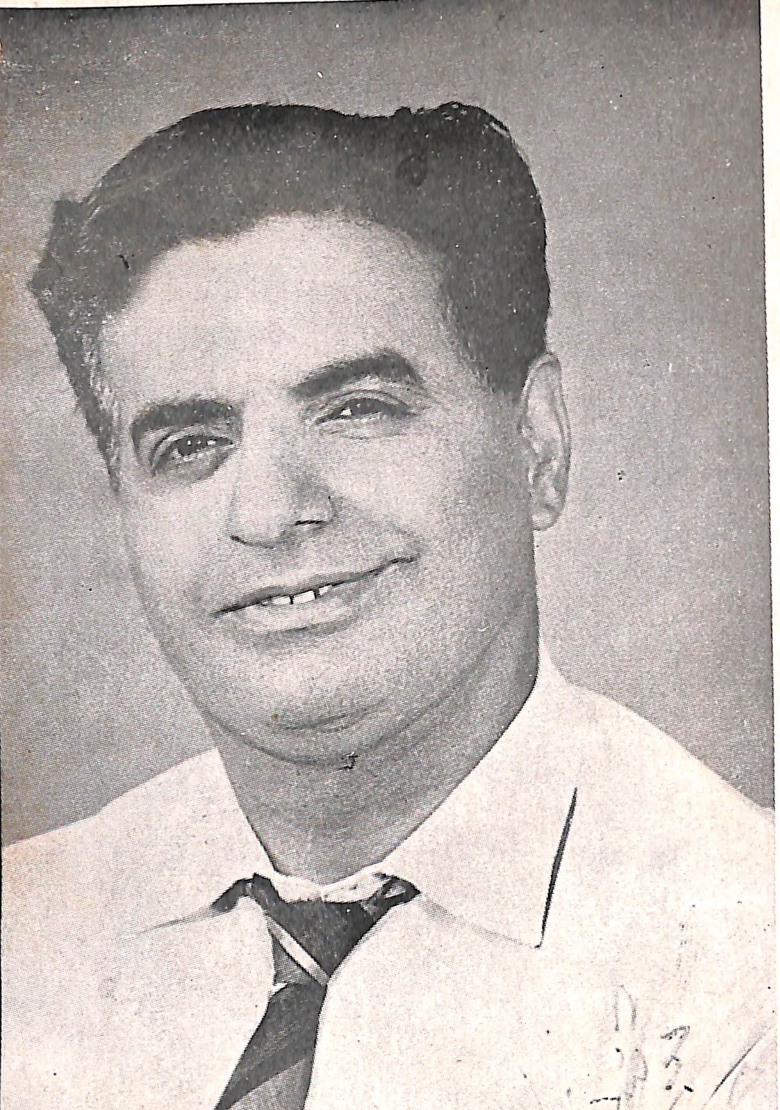
گذشتہ نمبر میں آلور کا افسانہ "نقصان" بیحد پسند کیا گیا۔ اس بار بلونت سنگھ کا افسانہ "پنجاب کا البیلا" بھی آپ کو ضرور پسند آئے گا۔ اسی افسانے پر مصنف کو مرحوم مولانا صلاح الدین احمد نے "پنجاب نگار" کے خطاب سے نوازا تھا۔

اس اشاعت میں اکثر قارئین کی یہ شکایت بھی دور کی جارہی ہے کہ 'شاہکار' میں ڈرامہ کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اُپندر ناتھ اشک کا ڈرامہ "کس کی بات" بھی آپ کو بہت پسند آئے گا۔ یہ ڈرامہ پہلے ہندی میں شایع ہو چکا ہے اور ہندی والوں نے بھی اسے کافی پسند کیا ہے کیونکہ جس ہندی کا اس میں مذاق اُڑایا گیا ہے اُسے عام ہندی والے بھی پسند نہیں کرتے لیکن، بدنصیبی دیکھئے کہ ہماری ہندی ریاستوں کی سرکاریں اسی زبان کو عوام پر ٹھونسنے پر مُصر ہیں۔

'شاہکار' میں حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کا گروپ فوٹو بھی بہت پسند کیا گیا۔ ہم ہر شہر کی ادبی شخصیتوں کی اجتماعی تصویریں ہر نمبر میں شایع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہوں تو ضرور کیجیے۔ بلاک بنوانے کے بعد تصویر واپس کر دی جائے گی۔

ناولٹ نمبر کے لیئے ابھی صرف دو ناولٹ منتخب ہو چکے ہیں۔ اگلے نمبر میں مفصل اعلان کیا جائیگا۔ ہم اسے ایک خوبصورت تحفے کی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

محمود احمد ہُنر





اُردو ہندی کے چند ادیب وشعرا

ساحر لدھیانوی، سمترا نندن پنت، امرت رائے، رام لعل، سجاد ظہیر، اِحتشام حسین، اندیور، مخدوم محی الدین

بلونت سنگھ

پنجاب کا البیلا

یوں تو اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی لیکن میں اس قدر دبلا پتلا اور منحنی سا لڑکا تھا کہ بہ مشکل گیارہ بارہ برس کا دکھائی دیتا تھا۔

ان دنوں میں شہر کے ایک اسکول میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور بورڈنگ میں رہتا تھا۔ یہ بورڈنگ تو برائے نام ہی تھا۔ اسے گھوڑوں کا اصطبل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ شہر سے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک بڑی سی عمارت تھی جس کے ارد گرد کچھ جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ عمارت چوکور تھی، اندر گھاس کا ایک بہت بڑا قطعہ تھا جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برآمدہ تھا۔ فرش کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور ان میں سے گرد نکل کر چلنے والوں کے قدموں کے ساتھ اڑا کرتی تھی۔ کمرے بہت بڑے بڑے تھے اور ایک ایک میں کئی کئی لڑکے رہتے تھے۔ ہر لڑکے کیلئے ایک الماری، ایک چارپائی، ایک کرسی اور آدھی میز مخصوص تھی۔

باورچی خانے کا کل انتظام لڑکوں کے سپرد تھا۔ رسوئی میں تین نوکر تھے۔ ایک باورچی اور دو نوکر کھانا کھلانے اور دوسرے کاموں کے لیے۔

باورچی خانے میں کوئی شے مدل ٹھوڑے آتی تھی۔ سب کے سب جاٹوں کے لڑکے تھے۔ گھی اور گیہوں گھروں سے آجاتے تھے اور ضروریات کی باقی چیزیں مثلاً ایندھن سبزی ترکاری مار دھاڑ سے حاصل کی جاتی تھی۔ ہوسٹل کے پیچھے ایک "ارائیں" کے کھیت تھے۔ اس ارائیں کی ایک طرح دار لڑکی اور دو سجیلے بیٹے تھے۔ دن بھر لڑکے ہوسٹل کی چھت پر بیٹھے لڑکی کو آنکھیں مار مار کر اشارے کرتے اور راتوں کو کھیتوں سے تازہ سبزیاں اڑا لاتے۔ بچارے ارائیں نے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے ان لڑکوں کی شکایتیں کیں۔ لیکن بچارا سوچ ہوئے چہرے والا سپرنٹنڈنٹ اپنی داڑھی کھجلا کر رہ جاتا۔ وہ خود ناچار تھا۔ ارائیں کو تشفی دے کر واپس بھیج دیتا اور لڑکوں سے محض زبانی بازپرس کرتا... لیکن لڑکوں کے معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔

سپرنٹنڈنٹ پکا سکھ تھا۔ خوب لمبی لہراتی ہوئی داڑھی۔ چھوٹی پیلے رنگ کی پگڑی پر اس کا بہ بڑا نیلے رنگ کا صافہ۔ تنگ پائجامہ، ڈھیلا ڈھالا کوٹ۔ اس کا ازار بند اس سے کبھی نہیں سنبھلتا تھا۔ ہمیشہ نیچے لٹکتا رہتا۔ ہر روز بلا ناغہ گوردوارے جا کر پاٹھ کرتا وہ لڑکوں کی اس زیادتی کے سخت خلاف تھا لیکن ہوسٹل میں اس کی حیثیت برائے نام ہی تھی۔ بچارے کی بیوی اور بچے ہمیشہ بیمار رہتے۔ انکی تیمارداری سے فرصت پاتا تو کبھی کبھار ہوسٹل میں آنکلتا۔ لڑکے بظاہر اس کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن حقیقت میں انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

جب وہ ہوسٹل میں داخل ہوتا تو عموماً باورچی خانے کا ایک نوکر اس کے ساتھ ہوتا برآمدے میں داخل ہوتے ہی وہ رک جاتا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اس کا منہ اور آنکھیں ہمیشہ سوجی رہتی تھیں اور آنکھوں سے ہمیشہ پانی بہتا رہتا تھا جسے وہ ایک جھاڑن نما رومال سے گاہے بگاہے صاف کر لیا کرتا تھا۔ آتے ہی وہ ایک ہلکی سی چھوٹی کھانسی کھانستا کہ سب کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے۔ سب سے پہلے وہ نوکر سے گفتگو شروع کرتا کسی معمولی سی بات پہ بازپرس ہونے لگتی "یہ ہوں... کیوں بے سور! یہ پانی تو نے گرایا... ابے راستے ہی میں... ایں؟... کس نے بھی گرایا۔ تو نے اسے صاف کیوں

نہیں کر دیا جھاڑ دے۔۔۔۔"

اتنے میں لڑکوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت آ گئے ہیں۔ عموماً سب سے پہلے بغداد سنگھ جس کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ تھا، لکّی کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھتا اور بڑی متانت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "ست سری اکال سردار جی!"

"ست سری اکال" پھر سپرنٹنڈنٹ کا پہلا سوال یہ ہوتا۔ "کیوں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

بغداد سنگھ یہ بڑا ہاتھ دھپ مارنے کے انداز میں اٹھا کر کہتا "سب ٹھیک ٹھاک ہے جی!"

سپرنٹنڈنٹ قدرے سکوت کرتا۔ اب اور لڑکے بھی جمع ہونے شروع ہو جاتے۔ سپرنٹنڈنٹ کے جسم کی بناوٹ بھی عجیب سی تھی۔ موٹا تو وہ تھا ہی، لیکن ورزش نہ کرنے کی وجہ سے اوپر کا دھڑ اور ٹانگیں ہلکی تھیں اور پیٹ خوب پھولا ہوا۔ چنانچہ وہ جب اطمینان کے ساتھ بڑی سنجیدہ صورت بنا کر کوٹ کو پیٹ کے آگے سے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو کولہوں پر رکھ کر کھڑا ہوتا تو اس کا پھولا ہوا پیٹ اور بھی آگے کو بڑھ جاتا اور وہ کسی سپیرے کی بین کی طرح نظر آنے لگتا۔ اسے دیکھ کر لڑکوں کو ہنسی آ جاتی۔ سپرنٹنڈنٹ دل میں سمجھتا تھا کہ لڑکے اسی پر ہنس رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مقبول ہونے کی غرض سے ذرا بے تکلف ہو کر بناوٹی غصہ سے پوچھتا "بغداد سنگھ تم بڑے شیطان ہو گئے ہو؟"

"جی میں؟" بغداد سنگھ اپنی موٹی سی انگلی اپنے سینہ پر رکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا "واہگورو۔۔۔ میں تو آپ کا داس ہوں جی۔ کہئے تو ابھی سر اتار کر رکھ دوں قدموں میں۔"

اس بات پر لڑکے خوب قہقہے لگا کر ہنستے۔ کوئی لڑکا کسی کی اوٹ میں ہو کر کہتا۔ "کس کا سر؟"

اب بغداد سنگھ جھنجھلا کر للکارتا "اوئے اوئے۔۔۔ بچُّو سردار جی کھڑے

ہیں ورنہ ابھی تیرا مور بنا دیتا پکڑ کر۔"
اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ اسی طرح باتیں کرتا ہوا سارے ہوسٹل میں لٹو کی طرح گھوم جاتا اور باہر نکلنے سے پہلے ایک مرتبہ لڑکوں کو تنبیہ کے طور پر کہتا "اچھا اب سبزی بازار سے آتی ہے نا؟"

"جی ہاں لیکن...... اب تو ہم روز کا حساب بھی لکھ کر رکھتے ہیں۔ دیکھئے گا؟"
وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ لیکن وہ اسی بات پر مطمئن تھا کہ کم از کم اس کی عزت تو رکھ لیتے ہیں۔ وہ اسی بات پر اپنی خیر مناتا حساب وغیرہ دیکھے بغیر اچھا اچھا کہتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے جانے کے بعد لدھا سنگھ پانی کے گلاس میں سے چند بوندیں آنکھوں پر ٹپکا لیتا۔ کوہنی پر ہاتھ رکھ کر تولیے سے آنکھیں پونچھتا ہوا کہتا "ادھوں ادھوں بغداد سنگھ! سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

میں نہ صرف کمسن بلکہ دبلا پتلا بھی تھا، اس لئے وہ سب مجھے بجائے میرے اصلی نام کے بکری سنگھ کہہ کر پکارتے تھے بکری سنگھ نام تو بہت برا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد میں اس نام سے مانوس ہو گیا۔ اب مجھے بکری سنگھ مذاقاً شاذ و نادر ہی کہا جاتا تھا۔ نہایت سنجیدہ گفتگو میں بھی سب مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ میں کمزور تھا اور وہ لوگ سرکاری سانڈوں کی طرح پلے ہوئے تھے۔ لیکن وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانا گئو ہتیا کے برابر پاپ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی میں طیش میں آکر ان میں سے کسی کو لڑنے کے لئے للکارتا بھی تو وہ میرے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ میں اپنی کمزوری کے طفیل ان لوگوں میں قطعاً محفوظ تھا۔

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں کسی سکھ تہوار کی ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہوئیں تقریباً سبھی لڑکے بوریا بستر باندھ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ میں محنتی لڑکا تھا پہلے تو ہوسٹل ہی میں چھٹیاں گذارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر اتنے بڑے ہوسٹل میں اکیلے جی نہ لگا۔ نہ وہ تر و تازہ سبزیاں نہ وہ چہل پہل۔ رات کے وقت تاریک بر آمدوں

میں بھتنے ناچتے دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ دو ہی دن بعد میں نے بھی اپنے گاؤں جانے کی ٹھانی۔

گاؤں میں میری اماں، پھوپھی اور دو بڑے بھائی رہتے تھے۔ میں نے میلے کپڑوں اور چند کتابوں کی گٹھڑی باندھی اور سائیکل کے پیچھے کیریر پر رکھ کر رسی سے باندھ دی۔ پچیس میل کا سفر تھا۔ چپ، سولیوشن، ربڑ وغیرہ ضروری سامان چمڑے کے چھوٹے تھیلے میں رکھ لیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور دھوپ کی تمازت نسبتاً کم ہوئی تو چل دیا۔

اس وقت پانچ بجے تھے خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

جب شہر سے باہر نکل آیا تو ایک کمہار کی دوکان پر رکنا پڑا۔ میں شام کو جب کبھی ادھر سے گذرتا تھا تو میری آنکھیں کسی کی تلاش میں اس دکان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ کمہار کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا سن اگرچہ تیس سے کم نہ تھا۔ لیکن تھی بڑی طرحدار اور پھر اس کی چہاردہ سالہ لڑکی کے کیا کہنے۔ میں شرمیلا اور خاموش ضرور تھا۔ لیکن بچپن ہی سے بڑا حسن پرست طبیعت اور عاشقانہ مزاج رکھتا تھا۔ کمہار کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے سوہنی کا خیال آجاتا تھا۔ سوہنی بھی کمہارن تھی۔ وہ لوگ اس قسم کے قصوں کو مادر نہیں کرتے۔ اور انہیں ڈھکوسلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن میری فطرت کے سامنے یہ ذہرہ جبین لڑکی تھی۔ اس پر کوئی بڑے سے بڑا شہزادہ بھی عاشق ہو سکتا تھا۔ میرا عشق کس قدر بے بس اور اپنے آپ ہی میں سلگنے والا تھا۔ نہ میری شکل اچھی تھی نہ جسم بھنوال جب سوہنی کمہارن کی دکان پر گیا تھا تو اس نے ساری کی ساری دکان ہی خرید ڈالی تھی۔ لیکن میں دکان تو کیا خریدتا۔ بس اس کی صورت دیکھنے کے لئے وہاں چلا جاتا کبھی مٹی کا دیا یا ایک پیالہ یا صراحی خرید لیتا۔ اس کی ماں پرے کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے مطلوبہ برتن اٹھا اٹھا کر دکھاتی۔ اسکی ماں مجھے نابالغ سمجھ کر اس طرف زیادہ توجہ نہ کرتی تھی۔ ادھر میں جی بھر کر اس ننھی سوہنی کو دیکھا کرتا۔ وہ بھی الھڑ سی تھی۔ اسے کبھی میری آنکھوں میں کوئی

غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ وہ سرد مہری سے میری طرف دیکھتی "اچھا یہ پیالہ تمھیں پسند نہیں... کیا خرابی ہے اس میں... اچھا یہ لو...."

میں مرعوب ہو کر کہتا "نہیں نہیں اگر تم کہتی ہو تو میں یہی خرید لیتا ہوں"

وہاں برتن لا کر میں ہوسٹل کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیتا۔ اور دل شکستگی کے عالم میں ہوسٹل کے اندر داخل ہو جاتا تو اودھم سنگھ میرا منہ لٹکا ہوا دیکھ کر پکار کر کہتا "سنا بائی بجری سنہیا"

اس دن جب میں ان کی دکان کے سامنے رکا تو اس وقت ماں تو غالباً گرمی کے مارے مکان کے اندر گھس بیٹھی تھی۔ البتہ لڑکی سر پہ کپڑے کا ایک ٹکڑا اڑائے ادھر ادھر گھوم رہی تھی اس کا چہرہ گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ گال خوب سرخ ہو رہے تھے۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے کبھی اپنے گال چومنے کی اجازت دے دے.... "کیا چاہیے" اس نے پیٹھ موڑ کر کوئی برتن ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی اچھی صراحی طلب کی۔ اس نے نمکین مٹی کی بنی ہوئی صراحی میری طرف دھکیلتے ہوئے کہا "بہرے جاؤ پانی ایسا ٹھنڈا ہوا کرے گا کہ بس یاد کرو گے عمر بھر"

"عمر بھر یاد کرنے" والی بات تو اس نے محض دکانداری کے خیال سے کہدی تھی لیکن میرا دل چھاتی کے قفس میں سے نکل کر اس کے قدموں پر نچھاور ہو جانا چاہتا تھا۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ میں تو اسے ہر وقت یاد کیا کرتا ہوں لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ میں تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے دانت نکال کر کہا "اب میں گاؤں جا رہا ہوں"

"پھر کب آؤ گے" یہ کہہ کر وہ میرا جواب سنے بغیر اپنے کام میں مصروف ادھر ادھر گھومنے لگی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے جلدی جلدی دام دیئے اور پیڈل پہ پاؤں رکھ کر چل کھڑا ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخر اس نے یہ بات کیوں پوچھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک سراب ہے اسی لئے مجھے یہ اس قدر عزیز بھی تھا۔ دل ہی دل میں شاداں و فرحاں سفر پر روانہ ہو گیا۔

دھوپ ہلکی پڑ چکی تھی لیکن گرمی اب بھی کافی تھی۔ سڑک بڑے بڑے کھیتوں میں سے ہو کر

جاتی تھی۔ راستے میں سڑک کے ذرا پرے ہٹ کر جا بجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کنوؤں کا صاف و شفاف پانی چھاؤں میں گرتا ہوا آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اِن پُران کنوؤں کے اردگرد قینچی سے کتری ہوئی داڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کے تہبند باندھے، بڑے سرور کے عالم میں حقے گڑگڑاتے نظر آتے تھے۔ جب کنوؤں پر کام کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں کھیتوں میں مٹک مٹک کر اِدھر اُدھر چلتی تھیں تو ان کی لمبی لمبی چوٹیاں ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر لہراتی تھیں۔ بیلوں کی ٹانگوں میں گھس گھس کر بھونکنے والے کتے اپنا الگ شور مچا رہے تھے۔ اور اپنی میلی کچیلی چندریوں میں کٹے ہوئے گوبر کے ٹکڑے جمع کرنے والی لڑکیاں کبھی کبھی اپنا کام چھوڑ کر گلہریوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔

ابھی میں نے چار پانچ میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی۔ میں نے سڑک سے ہٹ کر پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ رہٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا چنانچہ ایک جوہڑ کے کنارے سائیکل کو لٹا دیا۔ ٹیوب میں بہت بڑا پنکچر ہو گیا تھا۔ ڈبل پنکچر لگانے میں بیس پچیس منٹ صرف ہو گئے۔ دو میل چل کر سائیکل کی ہوا پھر نکل گئی۔ اب کے پانی بھی قریب نہیں تھا چنانچہ سائیکل لڑھکاتے ہوئے آدھ میل کے قریب پیدل چلنا پڑا۔ سڑک کے کنارے ایک گاؤں آباد تھا۔ وہاں ایک سائیکل والے کی دکان بھی تھی۔ میں نے سائیکل اس کے سپرد کر دی۔ میرا لگایا ہوا پنکچر اکھڑ گیا تھا۔ اسے از سرِ نو درست کیا گیا۔ اسی گڑبڑ میں سورج افق تک جا پہنچا۔ اور میں نے ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا۔ پنکچر لگ جانے پر میں نے سائیکل خوب تیز چلا دی۔ یہاں تک کہ راستے میں مرغیاں کڑکڑاتی اور پر پھڑپھڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر دیواروں پر جا بیٹھیں۔۔۔ گاؤں سے باہر نکلا تو سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ کھلی ہوا تھی۔ دھواں، گرد، شہر کی پکی دیواروں کی تپش وغیرہ کا نام تک نہ تھا۔ کچھ دور تک میں نے خوب زور سے سائیکل چلائی۔ یہاں تک کہ میں ہانپ گیا۔ پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ آسمان تلے کھیت حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ببول کے درخت جھنڈوں میں ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑے ہوئے ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں کھیتوں کی پگڈنڈیاں قینچیوں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دور تک چلی گئی تھیں۔ دور افق میں

کوئی شخص گھوڑے پر سوار اسے سرپٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ اس قدر تیزی اور روانی سے جیسے نہ تو اس کا گھوڑا کبھی تھکے گا اور نہ زمین ہی کہیں پر ختم ہوگی۔ بس اسی تندی اور برق رفتاری سے ابد تک دوڑتا چلا جائیگا اور وہ خود اسی جوش و خروش سے رہتی دنیا تک اس پر بیٹھا رہے گا بلند پرواز پرندوں کی ٹکڑیاں آسمان کی طرف پرواز کرتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ پرندے چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح نظر آنے لگے۔ آسمان کی وسعت بے کنار تھی۔ اور پرندوں کی طاقت پرواز بے انداز ہوا کے جھونکے چلنے لگے اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اگے ہوئے پودے ایک رخ کو سر بسجود ہوئے جاتے تھے۔ جیسے کوئی ازلی نغمہ سن کر وہ ایک ساتھ سر دھن رہے ہوں۔ دراصل وہ شاہد قدرت کی ایک صدا تھی جسے سن کر سوار نے منہ زور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ پرندے تیر کی سی تیزی کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر گئے اور کھیتوں میں پودے وجد میں آکر جھومنے لگے۔

موسم خوشگوار تھا۔ میں نے روں روں کرتے ہوئے رہٹ کے قریب سائیکل روک لی۔ نہانے کو جی چاہ رہا تھا۔ چنانچہ میں کپڑے اتار کر او کوئیں جا گھسا بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے بندھے ہوئے تھے وہ سر ہلاتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے، تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ رہٹ گیت گانے لگا۔ اور پانی اس تیزی سے باہر گر رہا تھا، جیسے کنوئیں میں پڑے پڑے اسکا دم گھٹ گیا ہو۔ پھر پانی میرے جھلستے ہوئے جسم پر گرا تو میں نے ایک آسمانی فرحت محسوس کی اور سنبھل کر چبھال کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ پانی کی لہر کی طرح جاریک چادر میں اسے آسمان، زمین درخت پودے، کلیلیں کرتے ہوئے بچھڑے، قلابازیاں لگاتے ہوئے مینڈک سب میری مسرت میں برابر کا حصہ لے رہے تھے۔

میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا کسان، جسکی ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے کانوں کے پیچھے چمکتے پٹے نظر آ رہے تھے، حقہ گڑگڑاتا ہوا ادھر آنکلا۔ مجھے خوش دیکھ کر مسکرانے لگا۔ او میں سے نکلنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن سورج غروب ہو چکا تھا اور

ا؎ کنوئیں کا حوبچہ۔

افق کے قریب سیاہی مائل دھوئیں کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی..... چنانچہ میں اولوں سے نکلا اور گیلے بدن پر کپڑے پہن کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اب میں نے سوچا کہ راستے میں کسی جگہ پر بھی نہیں رکوں گا۔ میں نے سائیکل پہلے سے بھی تیز چلا دی۔ پکی سڑک کا تقریباً آٹھ میل راستہ رہ گیا تھا۔ اور کھیتوں کا راستہ تقریباً آٹھ میل اور تھا۔ میری سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ نصف منزل پر ایک گاؤں تھا جسے قلعہ کاہن سنگھ کہتے تھے۔ خاصہ بڑا موضع تھا۔ پانچ سات پکے مکانات بھی تھے۔ ایک چھوٹا سا اسکول بھی تھا۔ پہلے خیال آیا کہ آج کی رات اسی گاؤں ہی میں گزاروں۔ لیکن پھر گھر کا خیال آیا۔ ہمارے گھر کے صحن میں ایک چھوٹا سا کنواں تھا جس پر ایک لوہے کا ڈول پڑا رہتا تھا۔ سوچا کنوئیں پر ڈول بھر بھر کر نہاؤں گا۔ ماں کئی کئی تہوں والے پراٹھے پکائے گی اور میں ہری مرچوں کی چٹنی کے ساتھ مزے لے لیکر کھاؤں گا۔ اگر راستے میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ ہو تو میرے لئے گھر پہنچنا ناممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے پھر زور زور سے پیڈل چلانے شروع کئے۔ جب میں ایک زناٹے کے ساتھ گاؤں میں سے ہو کر گزرا تو گاؤں کے ننگ دھڑنگ پھولے ہوئے پیٹوں والے بچے "اوئے اوئے" کا شور مچاتے میرے پیچھے بھاگے۔ اروڑیاں[1] لونگھتے ہوئے کانے اور مریل کتے بھی ڈیلے ملاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے ہوئے۔ کتوں کو بے طرح بھونکتے دیکھ کر مسجد کے کچے چبوترے پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے طیش میں آکر حقے کی نے کھینچ ماری۔ گاؤں سے باہر ایک مردہ بیل پر جھپٹے مارنے والے بڑے بڑے گدھ شور و غل سن کر ہراساں ہو گئے اور اپنے لمبے لمبے پر پھڑپھڑاتے اور اچکتے ہوئے ذرا پرے ہٹ گئے۔ ادھر میں کسی فرار شدہ ڈاکو کی طرح بڑی تیزی سے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکے اور کتے بہت پیچھے رہ گئے اور انکا شور بھی مدھم پڑ گیا۔

آگے سنسان سڑک کے دونوں کناروں پر پاس پاس کھڑے ہوئے شیشم کے درختوں کے سلسلے شروع ہو گئے۔ ان کی نیچے گری ہوئی خشک پتیاں میری سائیکل کے پہیوں کے نیچے چر مر کرتی ہوئی گھومنے لگیں اور گاؤں کے بچوں کی طرح وہ دور تک تیزی سے چکر کھاتی ہوئی میرا

۱ـ کوڑے کا کھتہ۔ کوڑی

چھپا کریں اور پھر جیسے دم پھول جانے پر نہ ہنس کر ایک جگہ بیٹھ کر رہ جاتیں۔
اب اکا دکا تارا بھی نظر آنے لگا تھا اور شفاف آسمان پر زرد زرد چاند کسی تالاب میں تیرتی ہوئی کانسی کی کڑاہی کی طرح معلوم ہوتا۔

دائیں بائیں دور تک ناہموار زمین چلی گئی تھی۔ غار دار جھاڑیوں کے سلسلے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں پر بھیڑیوں کا بھی خطرہ تھا۔ اگر بھیڑیوں کا کوئی غول آن گھیرے تو پھر؟ میں خوفزدہ ہو کر سائیکل اور بھی تیزی کے ساتھ دوڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ غروب آفتاب کے بعد دن کی رہی سہی روشنی بھی ختم ہو گئی۔ صرف چاند کی پھیکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی شیشم کے درختوں کی وجہ سے سڑک پر اور بھی زیادہ گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ میں اس سے پہلے صرف دو مرتبہ یہ سفر اکیلا کر چکا تھا۔ لیکن دونوں مرتبہ دن ہی میں سفر ختم ہو گیا تھا—— میرا خیال تھا کہ دو ڈھائی میل پر کھاکو شاہ کے مقبرے کے قریب سے سڑک چھوڑ کر اپنے گاؤں کی طرف گھوم جاؤں گا۔ دل کو کچھ اطمینان ہو چلا تھا کہ کم از کم سڑک کا سفر تو ختم ہونے والا تھا۔

میں اندھا دھند چلا جا رہا تھا کہ آگے سڑک رکی ہوئی معلوم ہوئی جیسے نئے سرے سے بنائی جا رہی ہو۔ میں نے سائیکل دھیمی کر دی۔ نزدیک پہنچ کر پتہ چلا کہ واقعی سڑک بن رہی ہے ساری سڑک اکھڑی پڑی تھی۔ مجبوراً سائیکل سے اتر کر ناہموار زمین پر پیدل چلنا پڑا۔ یہ ایک نئی آفت آن پڑی تھی۔

راستے میں سڑک کے کنارے کنارے پٹھان مزدوروں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں یہ لوگ انھیں "راشے" کہا کرتے تھے یہ "راشے" خوب موٹے تازے اور ہیبت ناک صورتوں والے ہوتے تھے میں نے سنا تھا کہ یہ لوگ بچوں کو بوریوں میں بند کر کے کابل لے جاتے ہیں اور آٹھ دس روپے میں بیچ ڈالتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوفزدہ بھی تھا لیکن بظاہر بڑے حوصلے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی لرزتی ہوتی روشنی میں راشوں کے چہروں کے خوفناک خطوط، الجھے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

بڑی مشکل سے یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اور میں پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔
اس وقت تک مجھے ... گاؤں پہنچ جانا چاہیے تھا یا گاؤں کے قریب ہی ہونا چاہیے تھا۔

اب سوائے سفر جاری رکھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کاکو شاہ کے مقبرے کے قریب پہنچکر میں پگڈنڈی پر ہو لیا۔

تنگ راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے مجھے سائیکل سے اترنا پڑا کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ مجھے ایک نشانی یاد تھی۔ دو فرلانگ کے قریب ایک پرانا رہٹ تھا جو جنگل سنسان پڑا تھا میں نے پہلے اسی کا رخ کیا جب پانی سے بچتا ہوا کنوئیں تک پہنچا تو دیکھا آگے پانی اور بھی زیادہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے پگڈنڈی پانی ہی میں گم ہو گئی تھی میں پانی سے بچتا ہوا خشکی کے راستے چلتا گیا۔ دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پانی کم ہوا۔ اور میں اندازاً گاؤں کی طرف چل دیا لیکن بہت دور نکل جانے کے بعد بھی گاؤں کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔

دھندلی چاندنی میں میں چلتا ہی گیا۔ اب مجھے شک گذرا کہ کہیں میں نے غلط راستہ تو اختیار نہیں کر لیا ہر طرف نگاہ دوڑائی کھیتوں اور درختوں کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ بعض کھیتوں میں کوئی فصل بھی کھڑی نظر آجاتی تھی۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ یونہی اندھا دھند چلتا گیا کہ دفعتاً مجھے دور سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ کوئی ترچھا بانکا سانڈنی سوار چلا جا رہا ہے سنسان جگہ کھلی چاندنی جھینگروں کا شور ...... پہلے خیال آیا اسے آواز دیکر راستہ دریافت کروں لیکن اس کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ میں نے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا بلکہ سوچ میں پڑ گیا کہ نہ معلوم کون ہے کا ش! وہ مجھے دیکھے بغیر آگے نکل جائے۔ میں سمٹ کر کیکر کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا لیکن اس درخت کے سائے میں بھی انسان کسی شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا ...... اس کے ہاتھ میں ایک لمبے دستے کی کلہاڑی دیکھ کر دم اور بھی خشک ہو گیا۔

وہ اپنے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی ...... دفعتاً اس نے رخ بدلا اور بظاہر میری طرف مڑا۔ میں نے سوچا شاید وہ اس راستے سے سیدھا آگے کو چلا جائیگا چنانچہ میں ذرا پہلو بدل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ سیدھا میری طرف آیا اور قریب پہنچکر اس نے سانڈنی روک لی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اونٹ کے اوپر ایک اور اونٹ بیٹھا ہوا ہے وہ ایک لمبا تڑنگا اکہرے بدن کا مضبوط سکھ تھا۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا۔ ڈاڑھی چھوٹی چھوٹی

اور چھدری سی بھنویں گھنی، ناک جیسے بطخ کی چونچ، نتھنے پھولے ہوئے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی مگر چمکدار ٹھوڑی عین بیچ میں سے دبی ہوئی، کانوں میں سنہری بالیاں گلے میں سونے کا چمکتا ہوا کنٹھا۔

وہ تھوڑی دیر تک منہ کھولے میری جانب دیکھتا رہا پھر اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کہو بھئی لونڈے! کون ہو تم؟"

میرا دل ڈوب گیا۔ "جی میں گاؤں جا رہا ہوں۔"

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"شہر سے۔"

"شہر سے ...؟"

"جی۔"

"کیا کرتے ہو وہاں؟"

"جی پڑھتا ہوں۔"

"کیا پڑھتے ہو؟"

میں اس سوال پر چکرایا۔ "کتابیں پڑھتا ہوں جی۔"

اس نے سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی گٹھڑی کو کلہاڑے کے دستے سے کچوکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"جی اس میں میلے کپڑے ہیں ... کیا جی کھول کر دکھاؤں؟"

وہ ہنس پڑا۔ "رہنے دو۔"

میری جان میں جان آئی۔ اس نے ڈاچی کی نکیل کھینچی اور چلنے ہی لگا تھا کہ پھر رک گیا

"کہاں جا رہے ہو؟"

"جی اپنے گاؤں کو۔"

"کون گاؤں؟"

"جی کالی گدھ۔"

"اکال گڈھ؟"

"جی"۔

اس نے قدرے سکوت کیا۔ پھر اپنے کلوں کے نیچے زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "ادھر آؤ"۔

میں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا۔ اس نے کہا۔ "سائیکل نیچے رکھ دو"۔

میں نے سائیکل زمین پر ڈال دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "میرا ہاتھ پکڑ کر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ"۔

میں ڈرا لیکن اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے پیچھے اڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اوپر بیٹھے بیٹھے کلہاڑی میں سائیکل اڑا کر اوپر کھینچ لی۔ نکیل کو جھٹکا دیا اور سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے روانہ ہو گئی۔

میں نے اس کی پسینے میں تر گردن پر نظر جما دی۔ اس کے سر کے بال اس قدر کھینچ کر بندھے ہوئے تھے کہ اس کی گدسی پر بالوں کی جڑوں کا گوشت اوپر ابھر آیا تھا۔ جیسے ننھی ننھی پھنسیاں نکل آئی ہوں۔ اس نے پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا گاؤں کدھر کو ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اب تم اپنے گاؤں ہی کو جا رہے تھے"۔

"جی میں راستہ بھول گیا تھا۔ میں پہلے شہر سے صرف دو ہی مرتبہ آیا ہوں لیکن دن ہی دن میں گھر پہنچ جاتا تھا لیکن آج رات ہو گئی اور پھر راستہ میں پانی بھی کھڑا تھا۔ اس لئے مجھے راستے کا پتہ ہی نہیں چلا"۔

اس پر اس نے اپنی بے باک آواز میں قہقہہ لگایا۔ "میاں! اگر تم رات بھر بھی اس طرح چلتے رہتے تو کبھی اپنے گاؤں نہ پہنچ پاتے.... تمہارے جیسے چھوٹے لڑکوں کو رات کے وقت سنسان جگہوں میں ہرگز نہیں گھومنا چاہیئے"۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ خوب مزے مزے کی باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو میں دل ہی دل میں بہت ڈرا۔ میں نے سنا تھا کہ بعض لوگ نوعمر لڑکوں کے سروں میں سے مومیائی نکالا کرتے ہیں۔ سر مونڈ کر چوٹی میں ایک کیل ٹھونک دیتے ہیں اور ٹانگیں باندھ کر درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور سر کے نیچے آگ جلا کر ایک کڑاہی رکھ دیتے ہیں۔ آگ کی گرمی سے سر کی چربی پگھل جاتی ہے۔ اور

مومیائی کیل کے سرے سے بوند بوند گر کے کڑاہی میں ٹپکتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سر کی ساری مومیائی نکل جاتی ہے اور لڑکا مر جاتا ہے۔۔۔۔ سانڈنی سوار کی صورت تو ہیبت ناک ضرور تھی لیکن اس کی باتوں سے کسی قسم کے خطرے کی بو نہ آتی تھی۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور خوش مزاج شخص تھا۔

کہنے لگا کہ تمہارے گھر میں کسی نے دن کے وقت کہانی کہی ہوگی تبھی تو تم راستہ بھول گئے۔

میں سانڈنی کے کوہان سے پھسلا جاتا تھا چنانچہ میں اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ اس کی گاڑھے کی قمیض پسینے میں تر ہو رہی تھی بغلوں سے ہلکی ہلکی بو بھی آ رہی تھی۔ بازوؤں کے گھنے بال پسینے میں تر ہو کر چپک گئے تھے۔ اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے نیچے کو لٹکتے ہوئے پھندنے میرے نتھنوں اور آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔ مجھے پہلے کبھی اونٹ کی سواری کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس قدر تکلیف دہ سواری تھی کہ بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا اور وہ میری تکلیف سے بے خبر اندھا دھند سانڈنی دوڑائے چلا جا رہا تھا۔۔۔ وہ بڑا باتونی شخص تھا۔ اس کی بھاری بھرکم بھرپور آواز اور قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔

ہم ایک ایسے درخت کے قریب سے گزرے جس پر بیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔ ایک گھونسلہ تو میرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے اسے کھسوٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن گھونسلہ میری زد سے باہر رہا۔ وہ کہنے لگا: "بیا بڑا سمجھ دار پرندہ ہوتا ہے۔ وہ اپنا گھونسلہ بڑی محنت اور کاریگری سے بناتا ہے۔ دنیا میں کوئی پرندہ اس قدر خوبصورت گھونسلہ نہیں بنا سکتا۔ تم نے بانسوں پر لٹکتے ہوئے گھونسلے نہیں دیکھے؟ بیحد خوشنما ہوتے ہیں ہوا میں لہراتی ہوئی ٹوپیاں سی۔ بیئے پھدک کر کبھی اندر چلے جاتے ہیں۔ کبھی باہر آجاتے ہیں۔ اور ایک قسم کا گھونسلہ بھی بناتے ہیں یعنی ایک تو اپنے رہنے کے لئے نرم تنکوں اور پتوں سے جس میں ایک طرف کو اندر جانے کا راستہ ہوتا ہے۔ اور دوسرا گھونسلہ جھولے کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب بادل گھر گھر کر آتے ہیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے، سرد ہوا کے جھونکے چلتے ہیں تو بیئے چہچہاتے ہوئے ان پنگھوڑے جیسے گھونسلوں پر پہنچ جاتے جھولا جھولتے ہیں!"

مجھے اس کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہوئیں۔ میں نے کہا: "سنا ہے بیئے اپنے گھونسلوں میں روشنی کرنے کے لئے جگنو پکڑ کر گھونسلوں کے اندر تنکوں میں اڑس دیتے ہیں!"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا "ہاں یہ درست ہے یہ بہت ہی سیانا پرندہ ہے"

اس پر میں نے اسے بندر اور بیئے کی کہانی سنائی جو میں نے تیسری جماعت میں اردو کی کتاب میں پڑھی تھی۔ اس نے بچوں کے سے انہماک کے ساتھ وہ کہانی سنی۔ اور جب میں نے کہانی کا نتیجہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔

اس طرح بندر سے دوسرے جانوروں کا ذکر شروع ہوا۔ میں نے بتایا کہ جب میں سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا آرہا تھا تو کس طرح مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں کسی جھاڑی میں سے کوئی بھیڑیا نہ نکل آئے۔

اس پر وہ پھر اپنے بے باک لہجے میں ہنسا "نہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اس علاقے میں بھیڑیے بہت کم ہیں۔ تاہم کبھی کبھار دکھائی بھی دے جاتے ہیں" پھر اس نے بتایا کہ شیخو پورہ کے علاقے میں آبادیوں سے پرے خونخوار بھیڑیے غول بنا کر گھوما کرتے ہیں۔ اور وہ قد میں گدھے سے کم نہیں ہوتے......

میں بہت حیران ہوا۔ میں نے پوچھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر جا نکلتا ہوگا تو بھیڑیے اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے ہوں گے۔

اس نے یہ بڑا منہ پھیلا کر کہا "ہاں..... ایک مرتبہ ایک آدمی ادھر سے جا رہا تھا........ میں نے یہ بات کسی سے سنی تھی....."

"کیا وہ کوئی بڑا طاقت ور شخص تھا؟"

"ہاں وہ بہت تگڑا آدمی تھا..... دوپہر کے وقت راستہ چلتے چلتے وہ تھک گیا تو ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ ایک جھاڑن میں روٹی بندھی تھی۔ اس نے روٹی کھائی اور پھر وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر تھوڑی دیر کے لئے اونگھ گیا۔ پھر یکایک اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کچھ عجیب عجیب سی آوازیں سنیں۔ اور اسے جھاڑیوں میں جانوروں کی تھوتھنیاں دکھائی دیں....."

میں نے اچھل کر کہا "وہ بھیڑیے ہوں گے۔ ہے نا؟"

"ہاں تم جانتے ہی ہو کہ بھیڑیے کا دہانہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کے جبڑے خون کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ بھیڑیا بہت ہی مکار جانور ہے....."

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بس بھئی۔ وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اردگرد کی جھاڑیوں میں بہت سے بھیڑیے بالشت بالشت بھر کی زبانیں نکالے چور نظروں سے اس کو گھور رہے ہیں..... اسے محسوس ہوا کہ اب وہ بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا تو اس کا تنا اس قدر چکنا تھا کہ اس پر پھرتی سے چڑھنا ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس پر چڑھنے کی کوشش کریگا تو بھیڑیے اس پر جھپٹ پڑیں گے..... لمحہ بہ لمحہ بھیڑیے اس کے قریب چلے آ رہے تھے۔ وہ اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اپنے گھیرے کو تنگ کئے جا رہے تھے۔ زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ نہ کوئی لاٹھی نہ ہتھیار...... اتفاق سے قریب دو چار اینٹیں نظر پڑیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے کبھی اس جگہ اینٹوں کا چولھا بنا کر روٹی پکائی تھی...... اس نے اپنی کھدر کی موٹی چادر کو دوہرا کر کے پھرتی سے وہ اینٹیں اس کے اندر رکھ کر انہیں گرہ دے دی۔ ابھی اس کے سرے ہاتھوں میں تھامے ہی تھے کہ سب بھیڑیئے ایک دم اس پر پل پڑے۔ اس نے چادر میں بندھی ہوئی اینٹوں کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا۔ جو بھیڑیا اس کے قریب آتا اینٹیں اس کی تھوتھنی پر اس قدر زور سے لگتیں کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ بھیڑیئے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے وہ بھی بڑی پھرتی اور تندی کے ساتھ اینٹیں گھماتا رہا۔ اس طرح قریب آدھ گھنٹے تک وہ بھیڑیوں کے حملوں کو ناکام بناتا رہا..... یہاں تک کہ وہاں چند راہگیر بھی آن پہنچے۔ انھوں نے دور ہی سے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ بھیڑیئے اس قدر شور وغل کی آوازیں سن کر بھاگ نکلے اور اس آدمی کی جان بچ گئی۔"

یہ سنسنی خیز قصہ سنا کر وہ سانڈنی کو گالیاں دینے لگا۔ اور میں اپنے خیالات میں کھو گیا۔ زرد چاند کی پھیکی روشنی میں دور دور تک کالے کالے درخت پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں بہت دور سے کسی کے گانے کی اڑتی ہوئی تان سنائی دینے لگی۔ سانڈنی اپنی بیڈھنگی

چال سے لپکی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک اونچے درخت کے قریب سے ہو کر گذرے جس پر خشک لوکیاں لٹک رہی تھیں۔ اس نے کلہاڑی کے دستے سے ایک لوکی کو ٹھکرا کر کہا "دیکھو یہ ہے تونبی بچپن میں جب ہم لوگ نہر پر نہانے جایا کرتے تھے تو بس اسی قسم کی تونبی بغل میں لیکر اپنا مزے سے بوتل کے کاگ کی طرح تیرا کرتے تھے۔"

لیکن میرا دھیان ابھی تک بھیڑیوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے پھر بات چھیڑی "کیا بھیڑیے بڑے آدمی پر کبھی حملہ کر دیتے ہیں؟"

اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اگر بھیڑیئے تعداد میں زیادہ ہوں اور کوئی اکیلا دکیلا آدمی مل جائے تو وہ اس پر حملہ کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن عموماً آدمیوں سے ڈرتے ہیں.... لو میں تمہیں ایک مزیدار قصہ سناتا ہوں..... یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے... تقریباً چار برس پہلے کی بات ہے ـــــ میں اپنے ننھیال کو جا رہا تھا۔ راستے میں جنگل پڑتا تھا۔ لیکن مجھے پرواہ نہ تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک بڑی لمبی لاٹھی تھی جس کے نیچے لوہے کی یہ موٹی شام لگی ہوئی تھی۔ اگر اس لاٹھی کی ایک بھی ٹھکانے کی چوٹ کسی بھیڑیئے کے سر پر پڑ جاتی تو وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ خیر! دوپہر کا وقت تھا۔ ابھی میں جنگل میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میں نے چونک کر دیکھا کہ میرے داہنے ہاتھ کی طرف کوئی جانور جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ بائیں ہاتھ کیطرف جھاڑی کے پیچھے ایک بھیڑیا کھڑا ہے.... میں چوکنا ہو کر راستہ طے کرنے لگا۔ جس جگہ جھاڑیاں ذرا کم ملتیں تو دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں دو بھیڑیئے تیس تیس یا چالیس چالیس قدم کا فاصلہ دے کر چلے جا رہے ہیں۔ میں نے لٹھ اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ اور ان پر نگاہ رکھتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔ کبھی وہ میرے قریب آجاتے اور کبھی پھر دور چلے جاتے۔ جب ہم گھنی جھاڑیوں میں سے ہو کر گذرتے تو وہ نظروں سے غائب ہو جاتے۔ مجھے اس وقت خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں حملہ نہ کر دیں اور جس جگہ جھاڑیاں کم ہو جاتیں وہ دکھائی دینے لگتے اور ہاں..... ایک عجیب بات دیکھی..... کبھی دائیں ہاتھ والا بھیڑیا بائیں ہاتھ کی طرف چلا آتا اور بائیں ہاتھ والا دائیں ہاتھ کی طرف چلا جاتا۔ اسطرح وہ سارے پھر ادل بدل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا۔ لیکن ان کو مجھ پر حملہ کرنیکی

جرأت نہیں ہوئی۔ جنگل ختم ہونے پر میں تو آگے بڑھ گیا۔ اور وہ جنگل ہی میں رہ گئے"۔

جب وہ اپنا قصہ ختم کر چکا تو میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اب وہ مجھے بہت ہی دلچسپ آدمی معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر دوستانہ تھا۔ اور باتیں ایسی سنسنی پیدا کرنے والی اور مزے مزے کی کرتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں ہی کرتا چلا جائے میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھیڑیوں کی کوئی اور کہانی سناؤ۔ وہاں قصوں کی کیا کمی تھی۔ اس نے کہا"۔ اب میں تمھیں اپنے پرنانا کا چھوٹا سا قصہ سناتا ہوں —— پرنانا یعنی میرے نانا کے باپ اپنے زمانے میں بہت ہی طاقتور شخص سمجھے جاتے تھے۔ علاقہ بھر کے لوگ ان سے تھر تھر کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے پرنانا اپنی پھوپھی سے ملنے کے لئے گئے۔ وہاں انھیں کچھ کام تھا۔ ڈیڑھ دو ماہ وہیں رہے۔ انہیں خبر ملی کہ گھر پر میرے نانا جو اس وقت بچے ہی تھے بیمار پڑ گئے ہیں۔ خبر ملتے ہی پرنانا فوراً اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلدی میں انھوں نے اپنے ہاتھ میں لاٹھی تک نہ لی۔ بیس پچیس میل کا فاصلہ تھا۔ وہ بڑی تیزی سے چلتے تھے۔ اس وقت چونکہ اپنے بیٹے کی بیماری کی فکر تھی۔ اس لئے ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچ جائیں۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گاؤں کے قریب سے ہو کر گذرے تو اس گاؤں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ وہ جس راستے سے جا رہے ہیں۔ ادھر سے نہ جائیں۔ بلکہ دوسرے راستے سے چلے جائیں۔ دوسرے راستے سے بہت بڑا چکر پڑتا تھا۔ اس لئے پرنانا اس راستے سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس راستے پر ایک بھیڑنی نے بچے دے رکھے ہیں۔ جو شخص ادھر سے گذرتا تھا وہ اس پر حملہ کر دیتی تھی چونکہ دوسرا راستہ بہت طویل تھا۔ اور انہیں جلد از جلد پہنچنا تھا، اس لئے انھوں نے لوگوں کے کہنے کی پرواہ نہ کی اور سیدھے راستے ہی سے جانے کی ٹھان لی۔ جب کوئی ایک ڈیڑھ میل آگے نکل گئے تو دیکھا کہ عین راستے کے بیچ میں ایک خشمگیں بھیڑنی بیٹھی ہے۔ وہ تھوڑا سا راستہ کاٹ کر گذرنے لگے تو اس نے ان پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے جھپٹ کر اس کے جبڑوں کے پچھلے حصے میں جہاں دانت نہیں ہوتے دونوں ہاتھ ڈال کر اس کا منہ پھاڑ دینے کی کوشش کی ادھر وہ جھنجھلائی لیکن زندگی اور موت کا سوال تھا۔ انھوں نے خونخوار جانور کو ٹانگوں میں جکڑ کر زور جو لگایا

تو اس کا منہ پھاڑ ڈالا۔ وہ بہت تڑپی اور انھوں نے ایک بڑی سی اینٹ سے اس کو جان سے مار ڈالا۔۔۔۔۔"

مجھے اس قصے میں بہت مزا آیا۔ اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے مگر اب میں کچھ تھک گیا تھا جسم بھی دکھنے لگا تھا۔

دور سے درختوں کے جھنڈوں میں سے روشنی چھن چھن کر نکلتی دکھائی دی جب ہم اور قریب پہنچے تو باجوں اور ڈھول کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دینے لگا۔ اس ویرانے میں یہ رونق! پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میلا لگا ہوا ہے۔ یہ بڑا میلہ سات دن تک مسلسل لگتا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں اور بھانت بھانت کے کھیل تماشے آتے تھے۔ میں نے دریافت کیا "کیا اب میلے میں چلنا ہوگا؟"

"ہاں مجھے وہاں ایک۔۔۔۔۔ سے ملنا ہے اور اس میلے کا مطلب ہی کیا ہے جہاں میل نہ ہو سکے۔۔۔۔۔ کیا سمجھے؟"

میں کچھ نہ سمجھا۔

اب ہم ایک چوڑے ریتیلے راستے پر ہو لئے۔ اس راستے کے دونوں کنارے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اور ان کناروں پر ببول کے اونچے اونچے درخت قطار در قطار میلے کے مقام تک چلے گئے۔

جب ہم قریب پہنچے تو کالے کالے درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے گیس کے ہنڈے اور خیمے نظر آنے لگے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے توں توں زیادہ رونق دکھائی دینے لگی۔ حلوائیوں، بساطیوں، کمہاروں، کھلونے اور شربت فالودے والوں کی دکانیں، ایک طرف اوپر نیچے گھومنے والے ہنڈولے اور دوسری جانب بازوؤں پر نام یا پھول وغیرہ گودنے والوں کے اڈے، گھوڑے، گدھے، تانگے، ٹھیلے، بیل اور اونٹ بھی نظر آنے لگے۔ اس وقت خوب گہما گہمی ہو رہی تھی۔ مردوں اور عورتوں کے جھلڑ کے جھلڑ ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ روشنی اور گانے بجانے کی وجہ سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔

میلے میں پہنچکر ایک درخت کے تلے میرے ساتھی نے سانڈنی کو زمین پر بٹھا دیا میں

اترا تو میری ٹانگیں سن ہو گئی تھیں۔ میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس لئے فوراً زمین ہی پر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال کر ہنسا "کیوں بس تھک گئے"!

میں کچھ جھینپ سا گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میرے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا "تمہیں بھوک تو لگی ہو گی خوب زور کی"۔

میرے اثبات میں جواب دینے پر وہ مجھے اپنے ساتھ لیکر حلوائی کی سب سے بڑی دکان پر پہنچا۔ کڑاہے آگ پر چڑھے ہوئے تھے۔ گرما گرم جلیبیاں اتر رہی تھیں پہلے تو اس نے مجھے گرم گرم جلیبیاں دلوائیں۔ مجھے بھوک بھی لگ آئی تھی۔ اس دن جلیبیاں کھانے کا بڑا لطف آیا اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا "بس اب تم جو جی چاہے کھاؤ خوب پیٹ بھر کر سمجھے"!

مجھے دکان پر چھوڑ کر وہ خود ایک طرف کو چلدیا۔ میں نے جو جی چاہا کھایا۔ جب کھا چکا تو حلوائی کے نوجوان لڑکے نے دام طلب کئے۔ میں بڑا گھبرایا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرا ساتھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب میں خوب پھنسا۔ میں نے حلوائی سے کہدیا کہ میرے پاس دام نہیں ہیں۔ اس پر نوجوان حلوائی نے کہا "کرسی پر بیٹھے رہو جب تک پیسے نہیں دوگے یہاں سے ہرگز نہیں جانے دونگا"! میں بہت پریشان ہوا۔ تھوڑی دیر بعد حلوائی پھر بکواس کرنے لگا۔ میں ڈرا کہ کہیں دو چار چپت ہی نہ جما دے........

اتنے میں بطخ کی چونچ کی سی ناک والا میرا ساتھی بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا آن پہنچا۔ اسے آتا دیکھکر میری جان میں جان آئی۔ اس وقت حلوائی کا لڑکا مجھے کھری کھری سنا رہا تھا۔ میرے ساتھی نے آتے ہی بڑی زوردار آواز میں اسے للکار کر کہا "ابے او حرامی کے پلّے!......کیا کہتا ہے ہمارے چھو کرے کو....."!

پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹیٹوا دبا لیا "برخوردار میرا نام جسّا سنگھ ہے جسّا سنگھ..."!

شور سن کر لڑکے کا باپ ہاتھ جوڑ کر دکان سے نیچے اتر آیا اور جسّا سنگھ کے سامنے رونی صورت بنا کر کھڑا ہو گیا "لالہ جانتے ہو میں کون ہوں...."!

لالہ ہانپ رہا تھا۔ مٹکے کی طرح پھولا ہوا اس کا پیٹ نیچے اوپر ہو رہا تھا "جی ان داتا

جانتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔"

جسا سنگھ نے اس کے نوجوان لڑکے کو گردن سے پکڑ کر اس زور سے پیچھے دھکیل دیا کہ وہ گرم گرم گھی کے کڑاہے میں گرنے سے بال بال بچا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" تو پھر اپنے اس لونڈے کو بھی بتا دو۔ کہیں مجھے اس کا بھرکس نہ نکالنا پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں بے سور تجھے اتنی جرأت کیونکر ہوئی کہ تو ہمارے لڑکے پر پیسے سے کے لیے چڑھ دوڑا ۔ ۔ ۔ ۔" وہ لال لال آنکھیں نکالے لالہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کے لوگ بھی آن جمع ہوئے۔ لالہ نے کدو سا سر ہلاتے ہوئے کہا "جی میں نے پیسے نہیں مانگے ۔ ۔ ۔ ۔ اجی مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوا اس حرامزادے نے کب پیسے مانگنے شروع کر دیئے۔"

جسا سنگھ نے کہا "خون پی لوں گا خون ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں انگریز کا راج نہیں میرا راج ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کہو تو دکان برابر کر دوں صبح تک۔"

اتنے میں ایک اور قد آور مسلمان نوجوان آگے بڑھا "ارے جانے دے یار غلطی ہو گئی بیچارے سے۔" جسا سنگھ نے گھوم کر دیکھا تو اسکی باچھیں کھل گئیں۔ دونوں بغلگیر ہو گئے۔ شاید بہت دنوں بعد دونوں دوستوں کا ملاپ ہوا تھا۔ نووارد بھی ایک خونخوار گدھ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

حلوائی کو اتنی ہی تنبیہہ کافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ میلے میں گھومنے لگے۔ وہ دونوں بہت دیر تک مقدموں، پولیس، اور تھانوں وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔

میلے سے ذرا ہٹ کر ایک جگہ کھلے کھیت میں الغوزے بج رہے تھے۔ لوگ ایک بڑے گھیرے میں بیٹھے تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ لوگ لاٹھیاں بغلوں میں دبائے ان کے سہارے سہج میں کھڑے تھے۔ بعض لاٹھیوں پر ٹھڈیاں ٹکائے اُچکے ہوئے کھڑے تھے۔ الغوزے بجانے والے کے قریب ایک گبھرو ہاتھ کان پر دھرے بڑے مزے میں پورن بھگت کا قصہ گا گا کر سنا رہا تھا۔ ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف گانے والے کی درد میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے والی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جب گانے والا ایک بول کہہ کر خاموش ہو جاتا تو الغوزوں کی لہکتی ہوئی دلکش آواز دو بولوں کے درمیانی وقفہ کو اور بھی دلکش بنا دیتی۔

ایک اور جگہ بہت بھیڑ تھی۔ خوب ہلڑ مچا ہوا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں

نے ایک رنگین مزاج سرمست بوڑھے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بوڑھے کی سپید داڑھی اور لمبے لمبے پٹے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پہلے وہ ایک لمبی سی ہانک لگا کر بڑی لے کے ساتھ کوئی عریاں سی بولی سناتا۔ لوگ قہقہے لگاتے اور وہ ہاتھ اٹھا کر چٹکیاں بجاتا اور کہنیاں ہلاتا ہوا اچھل اچھل کر رقص کرتا تھا۔ اس کے منہ میں ایک دانت تک نہ تھا۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ پھر اس نے بڑی شوخ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا۔ اور بلند آواز میں پکار کر بولا۔

"اوئے ـــ ناسے بابا کھیر کھا گیا۔

ناسے وسے گیا دوانی کھوٹی۔

ہو ہو۔"

"بلے اوئے بابیا"، ہر طرف سے تحسین اور آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

ہم اسی طرح گھومتے پھرتے چلے جا رہے تھے جبا سنگھ اور اس کا دوست عقابوں کی طرح آگے کو جھک جھک کر تالیاں بجاتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں ان کی لمبی لمبی ٹانگوں پر نگاہ رکھتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اتنے میں جبا سنگھ میری طرف مخاطب ہوا۔ "کاکا... کیا نام ہے تمہارا....؟"

میں بچو سنگھ کہنے ہی کو تھا کہ یکایک رک گیا۔ ورنہ میرا خوب مذاق اڑایا جاتا۔ میں نے سنبھل کر اصلی نام بتا دیا۔

"تم نے کبھی اونٹنی کا دودھ پیا ہے..... ہا! بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ آؤ تمہیں ایسا دودھ پلائیں کہ بس یاد ہی کیا کرو۔"

ہم میلے سے ذرا پرے ہٹ آئے۔ ایک جگہ بہت سی اونٹنیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ادھر ادھر کھلے میدان میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ان پر میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے آدمی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ روشنی کی کمی کی وجہ سے ان کے چہرے صاف طور پر نظر نہ آتے تھے۔ ہم بھی ایک چارپائی پر جا بیٹھے۔ جبا سنگھ نے اپنے سامنے دودھ دہایا۔ اور پھر تین ٹنڈیں[۱] دودھ

---

[۱] پنجابی۔ مٹی کا چھوٹا ڈول۔

کی کھیر ہوئی لایا۔ وہ دونوں تو اپنی اپنی ٹنڈیں ایک ہی سانس میں چڑھا گئے۔ لیکن میں باوجود شدید پیاس کے تین ساڑھے تین سیر کی ٹنڈ نہ پی سکا۔ چنانچہ جیا سنگھ میری ٹنڈ کا دودھ بھی پی گیا وہاں سے اٹھکر ہم پھر میلے میں واپس چلے آئے۔ ہم بہت دیر تک گھوم چکے تھے۔ ارد گرد کے دیہات سے آئی ہوئی عورتیں بھی واپس جا رہی تھیں۔ اگرچہ اب رونق کافی تھی لیکن جہاں تک عورتوں کا تعلق تھا محفل پہلے کی نسبت کچھ سرد پڑ چکی تھی۔

ایک طرف مجرے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک سفید ریش بزرگ سیاہ کپڑے پہنے تخت پوش پر جلوہ افروز تھے۔ دانتوں میں حقے کی نے دبی تھی ادھر ادھر عقیدتمندوں کا جگھٹا تھا۔ چند نوجوان عورتیں ہار سنگار کرنے کے بعد پاؤں میں گھنگھرو باندھ رہی تھیں۔ طبلے پر آٹا ملا جا رہا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد تھپ تھپ تھاپ کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ایک طرف سارنگی نواز بیٹھے سارنگیوں کے کان مروڑ رہے تھے۔ ادھر ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گز ہلتے اور ادھر ان کے بڑے بڑے پگڑ والے سر بھی بڑی ہم آہنگی کے ساتھ حرکت کرتے سب لوگوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں' جو بل کھا کھا کر سو طرح سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ سیاہ پوش پیر کی سرمگیں آنکھوں سے لیکر معمولی سے معمولی شخص کی آنکھوں تک سب انہی کی شیدائی تھیں۔

جیا سنگھ کے دوست نے مجرا دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جیا سنگھ کا بھی خیال تو یہی تھا لیکن شاید میرے خیال سے اس نے وہاں زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے وہ دوست سے رخصت ہوا۔ اور ہم لوگ اپنی سانڈنی کی نکیل پکڑ کر میلے سے چل نکلے۔

جب ہم میلے سے باہر آ گئے تو سامنے پھر گھنی گھنی جھاڑیاں اور اونچے اونچے درخت تھے۔ ہمارے دائیں بائیں اب بھی کوئی اکا دکا خیمہ نظر آ ہی جاتا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد جیا سنگھ رک گیا۔ اس نے مجھے وہیں ٹھہرایا اور سانڈنی کی مہار میرے ہاتھ میں دیکر خود اسی رتیلے راستے کے اونچے کنارے کی طرف رخ کر کے ٹن کے ایک اور درخت کے قریب پہنچا۔

وہ درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ درخت کے سائے میں ایک نوجوان عورت تنے کی اوٹ سے باہر نکل آئی۔ وہ دونوں ہنس پڑے اور بہت آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

مدھم روشنی میں اس عورت کی صورت صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ جب وہ باتیں کرتی ہوئی اپنی جگہ سے ایک طرف کو ہٹ جاتی تو چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے خطوط صاف صاف دکھائی دینے لگتے۔

وہ ایک خوب پلی ہوئی جنگلی بلّی کی مانند تھی۔ اس کے چلنے کا انداز بھی اس موٹی تازی بلّی کی طرح تھا جو پیٹ بھر کر چوہے کھا لینے کے بعد خُرخُر کرتی ہو۔ خوب کھنچی تنی ہوئی وہ ٹھساٹھس گوشت کا تڑپتا ہوا ایک ٹکڑا تھی۔ جیسے خربوزے کی قاش یا میٹھے سنگترے کی رس بھری پھانک۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی اوڑھنی کی ماجھی[1] بکل مار رکھی تھی جس میں سے اس کا صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر اس کے صحت ور گالوں پر اس قدر گوشت نہ ہوتا تو اس کی آنکھیں خوب بڑی بڑی دکھائی دیتیں۔ ابرو لچکیلی کٹار تھے اور دانت صاف و شفاف اور آبدار اخروٹ کے درخت کی چھال سے رنگے ہوئے مسوڑھوں میں سے ہنستے وقت اس کے دانتوں کی چمک بجلی کی طرح کوند جاتی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سمندر کی لہروں کا سا مدوجزر پیدا ہوتا اور وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی کسی مچھلی کی طرح پیچ و تاب کھانے لگتے تھے۔

وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر تو تھے ہی۔ پھر وہ باتیں بھی بہت دھیرے دھیرے کر رہے تھے۔ کم از کم میرے کان میں کچھ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ البتہ عورت کے ہونٹوں کے اُتار چڑھاؤ اور پیچ و خم سے معلوم ہوتا تھا کہ مضامین کے دفتر کے دفتر کھولے جا رہے ہیں... کبھی شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ٹھینگا دکھلانے کے انداز میں اوپر والا ہونٹ بھینچ کر نیچے کا ہونٹ آگے بڑھا دیتی... اس نے اپنی چندریا کو سنوارا تو اس کے سیاہ گھنے اور لمبے بال بارش کی بوچھاڑ کی طرح باہر نکل پڑے۔ اس کی خوش وضع گردن کی جھلک بھی لمحہ بھر کو دکھائی اور پھر اس کی بادل نما اوڑھنی میں روپوش ہوگئی۔ وہ مستی میں آئی ہوئی

---

[1] ماجھا پنجاب کا ایک مشہور علاقہ ہے۔

کبوتری کی طرح اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ . . . جبّا سنگھ نے غالباً اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عورت نے نرمی سے اس کا ہاتھ راستے ہی میں روک دیا اور بڑے بانکپن سے ٹھمک کر سپردگی کے انداز میں اس کے قریب ہو گئی اور اس کے کان کے پاس سرگوشی میں کچھ کہا۔ جبّا سنگھ نے میری طرف دیکھا اور کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ . . . پھر جبّا سنگھ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پتّوں میں سے چھَن چھَن کر آنے والی چاندنی میں عورت کی تیز آنکھوں میں سے روشنی کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ . . . اور جب جبّا سنگھ واپس لوٹا تو وہ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور کچھ غم ناک آنکھوں سے جبّا سنگھ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ اس کا ایک گال درخت کے تنے سے لگا ہوا تھا۔

ہم بدستور سابق سانڈنی پر سوار ہو گئے اور سانڈنی پہلے کی طرح بے ڈھب چال سے بھاگ نکلی۔ کافی دور آ جانے کے بعد میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ عورت ابھی تک اسی طرح درخت کے تنے سے سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

جب ہم کھیتوں میں پہنچ گئے تو جبّا سنگھ نے اپنا بھوڑے جیسا منہ کھول کر میری طرف دیکھا اور ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے تلے اس کے کچھ کھدّے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بھاری سی آواز میں بولا۔ "کیا سوچ رہے ہو ؟"

میں کچھ جھینپ سا گیا۔

سانڈنی نچلا ہونٹ آگے کو بڑھائے کسی روٹھی رانی کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلی جا رہی تھی۔ جبّا سنگھ نے لوہے کے کڑے والا ہاتھ اٹھا کر کان پر رکھ لیا، ایک لمبی ہانک لگائی۔ اس کے منہ میں سے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ زندگی سے بھرپور آواز نکلی جو فضا میں پھسلتی چلی گئی۔ اس قدر آزاد اور بھرپور آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کی آواز میں موسیقی نہ سہی لیکن ایک ایسی کشش، ایک ایسا خلوص اور گہرا پن تھا جس پر سنگیت

سے بھرپور ہزاروں آوازیں قربان کی جاسکتی تھیں۔ لمبی ہانک کے بعد وہ گانے لگا۔

"ادے

میں مل لاں تخت لاہور دا (میں لاہور کے تخت پر جا لوں)

میں کھوہ لاں راجے دیاں رانیاں (میں راجے کی رانیاں چھین لوں)

ادے۔ ہو ہو"

پھر اس نے بلند قہقہہ لگایا "لو میں تمہیں ایک اور گانا سناتا ہوں بہت مزے کا گیت ہے۔ ایک عورت جس کا نام بھاگن ہے اپنے ۔ ۔ ۔ یعنی سمجھے نا! اس سے پوچھتی ہے۔"

ہیں وے، کتھے چلے اد[1]

حاکماں تسی، تُسی وے، کتھے چلے اد۔

اب حاکم جواب دیتا ہے۔

ہے نی دِلی چلے آں[2]

بھاگنے! اسی، اسی نی دلی چلے آں

اس پر بھاگن کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں، کہتی ہے

ہیں[3] وے کی لیادوگے

حاکماں! تسی، تُسی وے کی لیادوگے

بھلا حاکم بھاگن کے لئے کچھ لانے سے کب چُوک سکتا تھا لیکن اس موقعہ پر اُسے شرارت سوجھتی ہے۔ وہ اصل تحفے کا تو ذکر کرتا نہیں بلکہ کہتا ہے۔

ہیں[4] نی! بِلی لیاواں گے

بھاگنیں! اسی، اسی نی بلی لیاواں گے۔

---

[1] ہاں اے حاکم کہاں چلے ہو تم۔ کہاں چلے ہو [2] اری بھاگن ہم دلی چلے ہیں [3] ہاں تو پھر تم دلی سے کیا لاؤ گے [4] ہاں ری بھاگن ہم دلی سے بلی لائیں گے۔

بلّی کا نام سُن کر بھاگن کا جی کٹ جاتا ہے، تیور بگڑ جاتے ہیں۔ پوچھتی ہے۔

بلّی کی کرے گی

حاکماں[1]! بلّی، بلّی وے کی کرے گی۔

حاکم کنکھیوں سے بھاگن کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے برہم ہو جانے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ہے نی نہوندر مارے گی[2]

بھاگنیں! بلّی، بلّی نہوندر مارے گی

بھاگن اس بات پر بظاہر مسرت کا اظہار کرتی ہے اور پھر طنزاً پوچھتی ہے

پیڑ کون بنھے گا۔

حاکماں! پیڑا، پیڑ وے کون بنھے گا[3]

اب حاکم کی باری تھی۔ بھاگن سمجھتی تھی کہ اب حاکم سے کوئی بات نہ بن پڑے گی۔ اب حاکم نے پہلے تو بھاگن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گئی۔ جب شرم کے مارے بھاگن کے رخسار سُرخ ہو گئے تو اس نے کہا۔

پیڑ نوں بنھیں گی

بھاگنیں پیڑا، پیڑ نی توں بنھیں گی[4]

اوہو ہو ہو

کیوں میرا گانا پسند آیا ؟"

گانا تو خیر جو تھا سو تھا ہی لیکن گانے میں جو زندگی اور للکار اور اس کے

---

[1] بلّی کیا کرے گی اے حاکم، بلّی کیا کرے گی [2] ہاں ری بلّی پنجے مارے گی [3] پیڑ کون باندھے گا اے حاکم، پھر پیڑ کون باندھے گا [4] پیڑ تو تو ہی باندھے گی بھاگن، پیڑ تو تو ہی باندھے گی۔

انداز میں جو بے باکی تھی وہ مجھے بہت پسند آئی۔

اس نے پوچھا۔ "تم بھی گانا جانتے ہو؟"

میں گانا نہیں جانتا تھا۔ کاش میں اسے گانا گا کر ہی سُنا سکتا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔ "وہ مسلمان کون تھا؟"

وہ ہنس پڑا۔ "وہ میرا جگری دوست ہے سمجھے۔ بڑے عرصے کے بعد بڑے گھر[1] سے آیا تھا۔ اچھا ہی ہوا جو مجھے مل گیا۔"

"بڑا گھر کیا ہوتا ہے؟"

"ارے تم بڑا گھر نہیں جانتے۔ ہائے افسوس تم بڑے گھر کبھی نہیں جا سکو گے۔ صرف بڑے دی ہی بڑے گھر میں جا سکتے ہیں... بس سردار بہادر! یہ سمجھ لو کہ بڑا گھر صرف انہی لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو سرکار کی خدمت کرتے ہیں۔ جب وہ خدمت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو انھیں آرام کرنے کے لئے بڑے گھر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر سرکار اور پرجا کی سیوا کے نئے نئے ڈھنگ سوچا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب آرام کرنے کے بعد سرکار کے بڑے گھر سے نکلتے ہیں تو پھر نئے نئے طریقوں سے بڑے زور شور سے پرجا کی سیوا کرتے ہیں۔ پرجا سرکار سے اُن کی پُر زور سفارش کرتی ہے۔ سرکار جتنی زیادہ خوش ہوتی ہے اتنی ہی جلدی ان سیوکوں کو بڑے گھر میں بھیج دیتی ہے۔ جو شخص جتنی زیادہ تندہی کے ساتھ خدمت کرتا ہے اتنے ہی عرصہ کے لئے اسے آرام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔"

میں بہت دیر تک اپنی عقل کے مطابق بڑے گھر کی بابت سوچتا رہا۔ جبا سنگھ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میرے اس دوست کا نام نورا ہے۔ اس کے بڑے گھر میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ ہم دونوں ایک گاؤں میں رات کے وقت کسی کے گھر میں گھس گئے۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ ہم ہر آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھے۔ کوئی غیر معمولی آواز سُنائی

---

[1] پنجاب کے دیہات میں قید خانے کو طنزاً بڑا گھر کہا جاتا ہے۔

نہ دی لیکن جب ہم باہر نکلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جس مکان کے اندر ہم گھسے ہوئے تھے، اسے گاؤں کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ لوگ اس گھر میں گھسے ہی کیوں تھے ؟"

"اوہو! دیکھو ننھے! ایسی باتوں میں لڑکنا اچھا نہیں ہوتا۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی وجہ سے کسی نہ کسی شخص کے گھر کے اندر گھس گئے تھے۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں گھر والوں کی نیند کیسے کھل گئی اور وہ سب گاؤں والوں کو کس وقت بلا لائے۔ ۔ ۔ ۔ اتنے آدمیوں کا اجتماع دیکھ کر ہم بہت گھبرا گئے۔ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہے۔ سوچتے تھے کیونکر صحیح وسالم باہر نکلیں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی پھر یہ بھی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ یہیں پڑے پڑے صبح نہ ہو جائے یا پھر وہ لوگ کہیں سے پولیس ہی کو نہ بلا لائیں۔ چنانچہ ہم دونوں نے مشورہ کیا اور ایک دوسرے کی پیٹھ کی طرف پشت کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ وسیع صحن اور گلی میں آدمی ہی آدمی کھڑے ہیں۔ لاٹھیاں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ بس ہم نے لاٹھیاں چلانی شروع کر دیں۔ ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس قدر جانفشانی سے ہم نے آج تک لاٹھی نہیں گھمائی تھی۔ لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ لاٹھیوں کی زد سے بچنے کے لئے وہ اِدھر اُدھر بچنے لگے۔ ایک بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی لیکن جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہم تعداد میں صرف دو ہی ہیں تو پھر ان کا حوصلہ بڑھا اور وہ لپک لپک کر ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم بھی لہولہان ہو گئے۔ ان کے گھیرے میں سے نکل کر جو ہم بھاگے تو آٹھ کوس تک بھاگتے ہی چلے گئے تاکہ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر ہمیں گھیر نہ لیں ۔ ۔ ۔ سمجھے میرا ہی دوست میرے ہمراہ تھا۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہیں پران تیاگ دیتا۔"

مجھے بہت تعجب ہوا۔ "کیا سارے گاؤں میں ایک بھی شخص ایسا نہ نکلا جو آپ کا مقابلہ کر سکتا ؟"

"کہاں بھیا! ہمارا مقابلہ کرنے کے لئے تو ان پاس پڑوس کے گاؤں میں سے کبھی کوئی نہیں نکل سکتا تھا۔ ہاں اگر کہیں میرے ماموں جیسا کوئی آدمی ہوتا وہاں تو پھر ہماری دال نہیں گل سکتی تھی۔"

"کیا آپ کے ماموں بہت طاقتور شخص ہیں۔۔۔۔"

"طاقتور ہے۔ میرے ماموں اس قدر طاقتور شخص ہیں کہ اِدھر اُدھر کے لوگ انھیں "رب" کہتے ہیں۔ بڑا بھاری ڈیل ڈول ہے ان کا۔ قد میں تو خیر مجھ سے بھی کچھ کم ہی ہیں۔ لیکن ان کی للکار ہی ایسی زوردار ہوتی ہے کہ کسی شخص کی ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے سامنے سر بھی اٹھا سکے۔ ان کا علاقے بھر میں بڑا دبدبہ ہے۔۔۔۔"

"کیا وہ کبھی چوروں کے ساتھ بھی لڑا کرتے ہیں، کبھی کوئی ڈاکو پکڑا انھوں نے؟"

"انھوں نے بڑے بڑے کام انجام دئے ہیں۔ تمہیں میں ان کی زندگی کا ایک چھوٹا سا بہت ہی دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت وہ گاؤں سے باہر مویشیوں کے باڑے کے پھاٹک کے قریب چارپائی ڈالے سو رہے تھے۔ ان کے سب مویشی باڑے کے اندر بند تھے۔ اتنے میں وہاں چور آنکلے اور انھیں گہری نیند میں مدہوش پا کر اندر گھس گئے اور بیلوں کی ایک بہت عمدہ جوڑی نکال کر چل دئے۔ ابھی وہ بیل ہانکتے ہوئے کوئی چالیس پچاس قدم ہی گئے ہوں گے کہ دفعتاً میرے ماموں کی آنکھ کھل گئی اور وہ فوراً بھانپ گئے کہ چور ان کے مویشی لئے جا رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پکار کر بولے "بھئی تم جو کوئی بھی ہو۔۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔۔۔۔ تم میرے مویشی تو لئے جا رہے ہو بڑی خوشی سے لے جاؤ لیکن اتنی بات یاد رہے کہ تم انھیں جہاں کہیں بھی لے جاؤ گے کل کے دن کے اندر اندر اگر میں اپنے مویشی واپس نہ لے آؤں تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔۔۔۔ اور یہ بھی سن لو کہ میرا نام دسوندھا سنگھ ہے۔"

وہ آدمی کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے مشورہ کرتے رہے، پھر ان میں سے ایک شخص پست آواز میں بولا "دسوندھا سنگھ سردار! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ تمھارے بیل ہیں، نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ چارپائی پر تم ہی سوئے پڑے ہو۔ ہم نے تمھارا نام سن رکھا ہے اس لئے ہم یہ بیل اسی جگہ چھوڑے جاتے ہیں!" چنانچہ انھوں نے دونوں بیل باڑے کی طرف ہانک دیے اور خود اپنی راہ پر روانہ ہو گئے۔"

مجھے اس کی باتیں سننے میں بڑا مزا آرہا تھا۔ خاموش رات میں سانڈنی کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں اس کی گونجتی ہوئی آواز ایک خاص کشش رکھتی تھی۔ میں اس سے کوئی بات دریافت کرنے ہی لگا تھا کہ ایک بڑے زور کی پھنکار سنائی دی۔ دیکھا تو پرے ایک اونچی سی جگہ پر پھن دار سانپ پھن اٹھائے لہرا رہا ہے۔

میرے جسم میں بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی۔ جتا سنگھ نے سانڈنی روک لی۔

کچھ دیر تک وہ سانپ کی طرف دیکھتا رہا "یہ سانپوں کا راجہ "ناگ" ہے۔ اُف کس قدر کالا ہے۔ اگر یہ کسی کو کاٹ لے تو اسے پانی مانگنے کی مہلت نہ ملے۔"

پھر اس نے مجھے سانڈنی پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود نیچے اتر گیا۔ سانپ ابھی تک پھن اٹھائے لہرا رہا تھا۔ جتا سنگھ نے کندھے سے چادر اتار کر بائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور داہنے ہاتھ میں لاٹھی لے کر وہ آگے بڑھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک اصیل مرغ کی طرح چوکنا ہو رہا تھا۔ اس کی گھنی بھوؤں تلے اس کی تیز آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنا لوہے کا کڑا کلائی سے پیچھے ہٹا کر بازو پر پھنسا لیا۔ سانپ کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور سانپ کی نظروں سے نظریں ملا کر کھڑا ہو گیا۔

میں ڈر گیا۔ میں نے اسے آواز دے کر واپس چلے آنے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود سانپ کے اور بھی نزدیک چلا گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھا، کوئی آدمی، جانور یا پرندہ نظر نہیں آتا تھا۔ چاند کی روشنی اب کچھ تیز ہو گئی تھی۔ ببول کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ ان کی شاخوں کی نازک سے نازک کونپلیں تک ساکن تھیں۔ وہ ایسی بے اعتنائی کے ساتھ کھڑے تھے جیسے انھیں اس بات سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ اس سنسان مقام پر انسان اور ناگ کا مقابلہ میرے لئے ایک نئی اور عجیب شے تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ دھوکے سے جیتا سنگھ کی ننگی ٹانگ پر دانت مارے گا اور وہ اسی وقت تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ واپس چلا آئے لیکن وہ میری بات سنتا ہی کب تھا۔ اب وہ عورت بھی بہت پیچھے رہ گئی تھی ورنہ میں بھاگ کر اسے ہی بلا لاتا۔ وہ تو اسے روک سکتی تھی۔

جیتا سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک چنچل بچے کی طرح ضدی اور کھلنڈرا دکھائی دے رہا تھا۔ سانپ کے قریب کھڑے ہو کر وہ اُچک کر اپنا تہبند اس کے پھن کے قریب ہلانے لگا۔ سانپ نے بھی پھن بڑھا بڑھا کر دو تین مرتبہ اسے کاٹنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ جو اس نے ذرا بڑھ کر چادر اس کے قریب کی تو نڈر سانپ اُچھل کر چادر سے لپٹ گیا۔ جیتا سنگھ نے چادر زمین پر پھینک کر اُسے لاٹھی سے پیٹنا شروع کیا۔ ایک لمحہ کے لئے سانپ اس کے پاؤں کے قریب دکھائی دیا۔ پھر وہ بھاگ نکلا۔ جیتا سنگھ بھی اُچھل کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پھر وہ ہموار ریتلی زمین پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے۔ سانپ پلٹ پلٹ کر اس پر حملے کرتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بہت دور نکل گئے۔ جیتا سنگھ کی لاٹھی بار بار ہوا میں بلند ہوتی تھی اور پھر دفعتاً جیتا سنگھ زمین پر گر پڑا.... اُٹھا اور پھر گر پڑا .... میرا دھڑکتا ہوا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ شاید وہ عورت جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، ابھی تک درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہو.... جیتا سنگھ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر

بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا سانپ نے آپ کو کاٹ کھایا تھا؟"

"نہیں تو" وہ ہنس کر بولا "وہاں گیلی زمین تھی۔ میرا پاؤں رپٹ گیا۔ دیکھو یہ میرا کچھا بھی کیچڑ میں خراب ہو گیا..... مگر کر میں اٹھنے لگا تو پھر گر گیا....."

"تو سانپ بھاگ گیا؟"

"بھئی نہیں سانپ کو بھاگنے بھی دیتا ہیں۔ تم جانتے نہیں اگر یہ سانپ ایک مرتبہ زخمی ہو کر بچ نکلے تو اپنے دشمن سے انتقام ضرور لیتا ہے۔ اسی لئے میں اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اب تو میں نے اس کا سر اچھی طرح کچل کر رکھ دیا ہے ..... آؤ نیچے اترو تمہیں بھی سانپ دکھا لائیں۔"

جب ہم مرے ہوئے سانپ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ کم از کم چھ ہاتھ لمبا سانپ تھا۔ پیٹھ بالکل سیاہ تھی۔ پیٹ سفیدی مائل تھا۔ بل کھایا ہوا مردہ سانپ اب بھی اس قدر خوفناک دکھائی دیتا تھا کہ اس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس بات کی مزید تسلی کر لینے کے بعد کہ سانپ واقعی قطعاً مر چکا ہے، ہم واپس آ کر سانڈنی پر سوار ہو گئے۔

میں نے زندگی میں اس قسم کے سنسنی خیز واقعات کم ہی دیکھے تھے۔ مجھے ابھی تک پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ جسا سنگھ کی جسارت احمقانہ حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی لیکن وہ پورے وثوق کے ساتھ نیچے اترا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سانپ کو مار ڈالے گا۔ لیکن رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سانپ جسا سنگھ کو کاٹ ہی کھاتا تو کیا ہوتا۔

جسا سنگھ نے سانڈنی کو للکار کر ہانکتے ہوئے کہا "یہ سانپ بہت ظالم ہوتا ہے۔ یہ گائے کا تھن منہ میں لے کر دودھ پی جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ انسان ذات کا دشمن بن بیٹھتا ہے۔ اس وقت اس کی کارستانیاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ جو آدمی دکھائی دے اسے

کاٹنے سے نہیں چوکتا۔ ایسا سانپ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور بھی چھوٹا سا ہوتا ہے اور بہت ہی چالاک اور مکّار۔
اس کو مار ڈالنا بھی آسان نہیں۔ بس ایسے سانپ سے واہگورو ہی بچائے۔"

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ جبا سنگھ نے کہا "بولو یہ سامنے تمہارا ہی گاؤں ہے نا؟"

میں اس کی باتوں میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے اِدھر اُدھر کا کچھ خیال ہی نہ رہا تھا۔ اب ہم گاؤں کے قبرستان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ جھڑبیریوں کے بیچ میں اُبھری اُبھری قبریں چاندنی رات میں اور بھی زیادہ بھیانک دکھائی دے رہی تھیں۔ سامنے نیم کے درختوں کے تلے چماروں کا کنواں بھی نظر آ رہا تھا۔ کنوئیں کی چرخی تاریکی میں کسی نقاب پوش آدمی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں سے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جہاں دن کے وقت مرغیاں اور ان کے ننّھے ننّھے چوزے پنجوں سے زمین کریدتے پھرا کرتے تھے۔ پرے چھوٹے چھوٹے درختوں کا جھنڈ تھا جو ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے چور گاؤں میں گھسنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہوں۔

جب ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو گاؤں کے عین سرے پر بنے ہوئے رہٹ کے قریب جبا سنگھ نے اپنی سانڈنی بٹھا دی۔ میری سائیکل اُتاری پھر خود اُترا اور مجھے بھی اُتارا۔ میری گٹھری میرے حوالے کر دی۔

گاؤں پر اس وقت سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی متنفّس دکھائی نہ دیتا تھا۔ آدھی رات کے قریب گزر چکی تھی۔ سب لوگ اپنے کچّے مکانوں کی چھتوں پر پڑے سو رہے تھے۔ صرف گاؤں کے دوسرے سرے سے کتّوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس نے چلتے ہوئے رہٹ سے پانی پیا۔ پانی کی بوندیں اس کی مونچھوں سے نیچے کی طرف لٹک کر لرزنے لگیں۔ میں نے سائیکل قریب کی ایک دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی۔ گٹھڑی بھی اسی پہ رکھ دی۔ جتا سنگھ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس سے اس قدر مانوس ہو چکا تھا جیسے ہم برسوں کے واقف ہوں۔ میں ایسے محسوس کر رہا تھا کہ آئندہ ہم زندگی بھر ساتھ ساتھ رہیں گے۔ اس نے اپنے بے تکلفانہ لہجے میں پوچھا۔ "کہو، اب تو گھر پہنچ جاؤ گے۔ راستہ تو نہ بھولو گے؟"

میں نے شرما کر کہا "جی نہیں، اب میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ نہ سکا کہ اس جذبے کا اظہار کیوں کر کروں۔ میں اسی کشمکش ہی میں تھا کہ اس نے پگڑی کے شملے سے مونچھیں اور داڑھی پونچھتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب تم گھر جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔"

میں نے اس کی پگڑی کے شملوں کی طرف دیکھا۔ ایک کان کے قریب لٹک رہا تھا اور دوسرا ہوا میں بلند پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بھاری ستون کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں کاٹھ کے سے ہاتھوں میں میرا کمزور اور چھوٹا سا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اس طرح اس قدر بڑے آدمی سے ہاتھ ملانے میں مجھے فخر محسوس ہوا۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ وہ ایک دم واپس جانے پر تل جائے گا۔ میں نے کہا۔ "آئیے، ہمارے گھر چلیے۔ گھر کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

یہ بات سن کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اس نے انگلی سے بڑے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا کہتے ہو! ... مجھے دیکھ کر خوش ہوں گے؟ ... ہا ہا ہا ہا۔"

ہنستے ہنستے اس کی ناک کی نوک سُرخ ہوگئی۔

میں نے اس کی اُنگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کیا تو پھر وہ کہنے لگا۔ "آج مجھے بہت ضروری کام ہے۔ اس لئے تم جاؤ۔ میں پھر کبھی آؤں گا۔ تمہارا نام تو میں جانتا ہی ہوں ....."

میں نے اُنگلی اُٹھا کر کہا۔ "ضرور۔"

"ضرور۔" وہ ہنسنے لگا۔

اس کے بعد وہ اپنی کلہاڑی سنبھالتا ہوا سانڈنی پر سوار ہوا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اُفق میں غائب ہوگیا —— گرد کے بادل اڑتے رہ گئے۔

لیکن وہ پھر کبھی نہیں آیا ..... کبھی نہیں۔

جوگندر پال

ہم جنس

ایلویٹر نائیٹ میں آج رات ہم کینیا کی آزادی کی پہلی سالگرہ منانے کے لئے "ہاؤس آف دام جی" کی طرف سے مدعو تھے۔

تقریب کی ابتدا دام جی کی "ویل کم اسپیچ" سے ہوئی۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین"۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور گویا جنس مخالف کو دیکھ دیکھ کر ان میں اپنی اپنی جنس کا احساس اُبھرنے لگا۔ "ہماری قوم کو پیدا ہوئے آج صرف ایک سال ہوا ہے، مگر یہ بچہ ایک سال میں ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ صرف کھڑا ہی نہیں ہوا بلکہ تیز تیز دوڑنے لگا ہے۔ حضرات! اس کا سبب وہ اِنرجی ہے جو اس بچے کو اپنے افریقی آبا و اجداد سے ورثے میں ملی ہے ——"

فنانس منسٹری کے بوڑھے یورپی سیکرٹری نے کوئی جملہ کسنے کے لئے آس پاس دیکھا کہ کوئی اور یورپی ہو تو اس کے کان میں بڑبڑائے مگر اپنے بالمقابل بیٹھے افریقی منسٹر سے اچانک آنکھیں ملنے پر وہ بڑی پُر وقار متانت سے مُسکرانے لگا۔

"دارائیٹ آنریبل منسٹر فار فنانس۔" دام جی کہہ رہا تھا۔ "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس بچے کی صحت مند پرورش کے لئے ہماری بسکٹ کمپنی گورنمنٹ کا بساط بھر ہاتھ بٹائے گی۔ ہماری بسکٹ کمپنی ——"

سب مہمانوں کی نگاہیں اپنے اپنے شراب کے گلاس پر جمی ہوئی تھیں کہ رام جی اپنی تقریر کو ختم کر کے قوم کی صحت کا ٹوسٹ تجویز کرے اور وہ سب فوراً اپنے گلاس تھام لیں۔

"آپ کو یاد ہو گا کہ گزشتہ سال ہمارے ملک کی آزادی —"

"ہمارے ملک کی!" مجھے اپنا ایک افریقی دوست یاد آنے لگا جو کہا کرتا تھا کہ ہماری آزادی کے بعد تم غیر ملکی سفید مائل قومیں بھی ہماری طرح کینیا کو اپنا ملک کہنے لگے ہو، لیکن یہ تمھارا ملک نہیں، ہمارا ہے، تمھیں یہاں سے نکلنا ہو گا یا —"

"یا کیا؟"

"یا اگر یہاں رہنا ہے تو منہ کالا کر کے رہو!"

میں اپنی میز کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سکاچ اینڈ سوڈا کے ساتھ ڈرائی چکن اور ہاؤس آف رام جی کے نمکین بسکٹ رکھے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر میری تنہا میز پر رام جی کی خوب صورت بیٹی بینا آنکلی تو میں یہ نمکین بسکٹ چبا چبا کر، اس کے باپ کے پُر ذائقہ نمک سے لطف اندوز ہو ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں گا اور اس دن کے جھگڑے کی اس سے معافی مانگ لوں گا۔

"معاف کر دو بینا۔ دیکھو میں تمھارے ڈیڈی کی ملازمت سے صرف تمھاری وجہ سے استعفا نہیں دیتا، ورنہ شیام پرشاد مجھے پورے ڈھائی ہزار ماہانہ کی آفر کر چکا ہے۔"

"بینا — بینا — آؤ ڈانس کریں —"

میں اپنی کرسی پہ بیٹھا بیٹھا بینا کے ساتھ ناچ رہا تھا اور میری میز پر سوائے میرے اور کوئی نہ تھا اور اپنی میز کی دو اور کرسیوں پر بھی گویا میں ہی بیٹھا تھا اور ہم تینوں یعنی میں اور میں اور میں ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ بینا کو آج گھیر کر ہی دم لیں گے۔ اور پھر میں — نہیں ہیں۔ نو، می — او حرام خور، پہلے بسکٹوں کو پیک تو

کرلو' پھر ایک ایک کرکے کھا بھی لینا —— !

"دا رائیٹ آنریبل منسٹر" ہاؤس آف دام جی لمیٹڈ کا مالک اَن لمیٹڈ تعظیم سے افریقی وزیر کی طرف سر جھکا کر شاید محسوس کر رہا تھا کہ وہ مندر میں کھڑا اپنے کسی کالے بھجنگ اور نہایت بلوان دیوتا سے پرارتھنا کر رہا ہے۔" پچھلے سال انڈی پنڈنس ویک میں ہمارے محبوب پرائم منسٹر نے ہاؤس آف دام جی کے جشنِ آزادی میں شریک ہو کر ہمیں اعزاز بخشا اور آج آپ کی شرکت سے ہمارا وقار دوبالا ہو رہا ہے۔ جنابِ مَن، مجھے ——"

بیٹا وہ میٹھی ہے' وہ اپنے باپ کی بڑی میز کے دائیں پہلو میں' اس افریقی ایگزیکٹیو سے جڑ کر اس سے سر نکالتی ہوئی' مالو کالی مٹی کے ٹیلے سے گلابی پھولوں کی کولی ٹہنی برآمد ہو رہی ہو۔

میں نے چاہا کہ اس ٹہنی کو نوچ کر اپنی میز کے فلاور واس میں لا سجاؤں اور پھر سکاچ اور سوڈا، ایک ڈبل، دو تین چار —— اور پھر بیٹھی ہو کر اس سجی ہوئی ٹہنی کو فلاور واس سے بھی نوچ لوں اور اسے مسل مسل کر —— نہیں بیٹا مسلنے کی شے نہیں' یا بڑے مجھے مسلنے کی شے ہے' بڑی احتیاط سے' تاکہ وہ اس کے بعد بھی جوں کی توں رہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میرے ذہن میں از خود خوش شکل اور لذیذ بسکٹوں کے فارمولے بننے لگتے ہیں جنہیں کھا کھا کر پیٹ نہیں بھرتا' زبان کھاتی اور بھوک بڑھتی چلی جاتی ہے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین' میں اپنی نو عمر کنٹین نیشن کی صحت کا ٹوسٹ تجویز کرتا ہوں" دام جی نے اپنا شراب کا گلاس اٹھا کر ہاتھ کو گرم جوشی کے اظہار کے لئے آگے پھیلا دیا۔

"فار ہیلتھ اینڈ ویلتھ آف دا گریٹ نیشن !"

"شاؤری افریکیہ[1] !" کالے وزیر کی افریقی صدا 'ایوٹرنایٹ' کے وسیع ہال میں ہمارے کانوں کو چھو کر غائب ہو گئی گویا ماؤ ماؤ کے ڈیڈن کی مکھی نے اپنے کسی پہاڑی

---

[1] افریقہ کے لیے !

ہائیڈ آؤٹ میں خوب سیر ہو کر شراب پی کے ہوا میں فائر کیا ہو اور جب انگریز افسر وہاں لپک کر پہنچے ہوں تو سوائے اپنے آپ کے انھیں کوئی اور دکھائی نہ دے رہا ہو۔

ہم سب تیز تیز 'افریکیہ' کا جام صحت پینے لگے اور ہمارے گلوں سے شراب یوں افراط سے نیچے بہنے لگی جیسے افریقی پہاڑوں میں ڈھکے چھپے سوراخوں سے آبشاریں غاروں میں گرتی ہیں اور یہ آبشاریں دیکھ دیکھ کر غاروں میں چھپے ہوئے بے ضرر اور ضرر رساں چوپائے مسرت سے ناچنے کے لئے اپنے اگلے دو پیر اٹھا لیتے ہیں، گر گر کر ناچتے ہیں۔

ہال کے کونے سے ڈانس فلور پر آرکسٹرا بجنے لگا اور یہ میوزک سن کر مجھے معلوم ہونے لگا کہ میرے دل پر کوئی نقب لگا رہا ہے۔

"بینا، تم ہمارے کنٹری وائیڈ فیمس اَیل کو ہلکی بسکٹوں کے مانند پُر ذائقہ اور نشہ آور ہو۔ میرے دِل میں داخل ہونے کے لئے یہ توڑ پھوڑ کیوں؟ جھگڑا کئے بغیر بھی تو تم مجھ سے مجھے لے سکتی ہو۔

"ہنس کے بولو بینا، تو میں کیا، تمہارے لئے میں اپنے جیسے دس اور مہیا کر سکتا ہوں۔ بس تم اک جھگڑا نہ بند کر دو۔ میرے دل پر نقب نہ لگاؤ۔ میرا دِل اڑانا چاہتی ہو تو اپنی یہ ضربیں روکو — روکو بینا —"

میں نے گلاس میں باقی ماندہ وسکی بھی خالی کر دی اور پاس ہی کھڑے ایک ویٹر سے مزید لانے کو کہا۔

"بینا مسکرا کر ملو تو میرا دِل دو چار سال کے لئے نہیں تو کم از کم چھ ایک ماہ کے لئے واحد تمہارا ہو کے رہ سکتا ہے، اس عرصہ کے دوران تمہارے باپ کی دی ہوئی سالم تنخواہ تم پہ خرچ کر سکتا ہے۔ تمہارا باپ مجھے بسکٹ بنانے کی ایک نئی مشین کے لئے انگلینڈ بھیجنا چاہتا ہے۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ ایڈن برا سے مشین کا کام ختم کر کے ہم لندن آ جائیں گے اور لندن میں ایک چھوٹا سا ہنی مون منا کر واپس۔"

ویٹر نے وہسکی اور سوڈا لا کے میرے سامنے رکھ دیا اور میں وہسکی کے ٹاٹ میں سوڈا انڈیلنے لگا۔ وہسکی کے گہرے رنگ میں سوڈے کے امتزاج سے ایک خوشگوار ہلکاپن آگیا، پیاری، ہلکی سی تازہ دم، گیس آور پر جوش زردی، گویا انسانی نسل کے ملے جلے خون کا ایک نوجوان، صحت مند چہرہ، جسے چوم لینے کو جی چاہے۔

میں نے گلاس کو بے اختیار منہ سے لگا لیا۔

میرے سر پہ ہاؤس آف دام جی کا اسسٹنٹ سیلز منیجر مکھامبا کھڑا تھا۔ دو اڑھائی سال پہلے مکھامبا ہماری کمپنی میں سیلز بوائے تھا۔ پچھلے سال آزادی کے موقع پر اسے سیلز مین بنا دیا گیا اور حال میں کمپنی نے اسے موجودہ پروموشن دی تھی۔ دام جی کی خواہش تھی کہ حکومت کی خوشنودی کے لئے چند ذمہ دار آسامیاں افریقیوں کو سونپ دی جائیں۔

"پلیز سٹ ڈاؤن، مکھامبا" وہ افریقہ کی کھلی دھوپ چھاؤں کے مانند مجھے بڑا عزیز تھا۔

"تھینک یو، بوانا۔ میری ایک دوست بھی آرہی ہے" وہ اپنے جنگلوں کے کسی تناور درخت کی طرح سارے کا سارا جھوم رہا تھا۔

"پینے کے لئے آئے ہو مگر معلوم ہوتا ہے پی کے آرہے ہو دوست۔ بیٹھ جاؤ نا" میں نے خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ "کہاں ہے تمہاری دوست؟"

"ذرا باتھ روم میں گئی ہے" وہ دبی دبی آواز میں ہنس کر بیٹھ گیا۔ "لیڈیز کا باتھ روم مجھے کہیں آس پاس نظر نہیں آیا، سو میں نے اسے ایک مردانہ باتھ روم میں ہی دھکیل دیا۔۔۔ وہ آرہی ہے" اس نے ہاتھ اونچا کر کے اپنی افریقی دوست کو ہماری میز کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

مکھامبا کی دوست کو دیکھ دیکھ کر مجھے اپنی بسکٹ کمپنی کی پروڈکشن نمبر چار سو تین کا خیال آنے لگا، چمکیلے سیاہ رنگ کا ایک نہایت سویٹ چاکولیٹ بسکٹ، جس کی شوخ

ل جناب کی فاصلہ آمیز تعظیم سے قریب تر۔

پیکنگ لنتر سے لپٹ سی جاتی ہے۔

میں اپنی میز کی خالی کرسی کو سیٹ کرنے لگا اور جب وہ پہنچ گئی تو میں 'ہیلو مادام' کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ مکھامبا میری طرف تشکّر سے دیکھنے لگا۔

"یہ میری دوست ہے، مِس ماٹی ___ اور یہ ہمارے ہاؤس آف دام جی کے پروڈکشن باس ہیں، لوانا چندو۔"

"پلیز بیٹھ جاؤ مادام۔" اس کی متوازن گھٹی ہوئی سیاہ باڈی کسی نہایت خوبصورت عورت کی پرچھائیں کی طرح ہلی اور بیٹھ گئی۔

"آپ کیا پئیں گی؟" میں نے ویٹر کو بلا کر مس ماٹی سے پوچھا۔

"رَم این جنجر۔" اس کی بجائے مکھامبا نے جواب دیا۔ "ہم دونوں کے لئے رَم این جنجر منگواؤ لوانا۔"

ویٹر چلا گیا تو مکھامبا مجھے ماٹی کے بارے میں مزید بتانے لگا۔

"ماٹی ہمارے قبیلے کے چیف کی بتیسویں اولاد ہے۔ اس کے تیس بھائی ہیں، پندرہ بہنیں، چھ مائیں اور ایک باپ ___ ہاں صرف ایک باپ، جو ہمارے قبیلے کا چیف ہے۔"

"تمہارا بھی تو ایک ہی باپ ہوگا مکھامبا۔"

"نہیں لوانا۔ میں اپنی ماں کے پانچویں شوہر کا بیٹا ہوں لوانا۔ اُسے کوئی جانور کھا گیا تھا ___ میرے باپوں کی تعداد ___ دراصل مجھے اپنے باپوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لوانا۔" رَم این جنجر آ گئی تو اس نے تیزی سے اپنا گلاس تیار کر کے اسے جھٹ خالی کر دیا۔

"ماٹی، تم ذرا ٹھہر جاؤ۔" اُس نے ماٹی کی رَم این جنجر بھی لے لی۔ "بات یہ ہے لوانا کہ میں ہمیشہ ایک کے بعد دوسرا ڈبل چڑھا کے ہی اپنے پینے کا سلسلہ شروع کرتا ہوں۔"

"ویٹر دو اور لاؤ"۔

ماتی مسکرا رہی تھی جیسے رین آکاش میں کوئی تنہا ستارہ کسی کی نظر پڑنے پر چپ چاپ ہنسنے لگے اور پھر جب تک اس کی طرف دیکھتے چلے جاؤ، اس کی ہنسی نہ تھمے۔

"لوانا، ایک دفعہ یوں ہوا کہ میرے پہلے باپ کی روح مجھ سے ملنے آئی"۔ لکھامبا اپنا کوئی قبائلی گیت سنانے کے انداز میں لہرا لہرا کر بتا رہا تھا۔ "یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں ہاؤس آف دام جی میں آنے سے بہت پہلے کسی وزونگو[1] کا ہاؤس بوائے تھا۔ میرا پانچواں باپ اُن دنوں مجھ سے ناراض تھا اور اس نے میرے گاؤں کے راستے مجھ پر بند کر رکھے تھے۔ روح نے مجھے اپنے دونوں گُم بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا اور مجھے بڑا پیار کیا اور بتایا کہ تمہارا بیج ضرور تمہارے پانچویں باپ نے بویا تھا، پر دھرتی اس کی ہوتی ہے جس کی سب سے پہلے ہو۔ تم میرے بیٹے ہو۔ میری کاشت ہو۔ اور لوانا، اس کے گلے لگ کر میں روتے روتے ہنس پڑا"۔ اس کے نشیلے قہقہے نے طفلانہ اُنسیت کا وہ لمحہ پھر اپنی گرفت میں لے لیا۔

"یہ ماتی ہے نا لوانا، اس کو سب سے پہلے لڑکی سے عورت میں نے بنایا تھا۔ اس لئے اب یہ سدا کے لئے میری ہے، خواہ میں مر جاؤں خواہ زندہ رہوں۔ اس کا بیٹا تمہارا بیٹا ہو تو بھی وہ میرا ہو گا"۔

"ماتی بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھنے لگی، مانو کالی دھرتی کے سینے میں ہل چل رہا ہو اور اس کی سختی پولی ہو ہو کر چاہ رہی ہو کہ اس کے انگ انگ سے کھنبوں کی ہریالی پھوٹ آئے۔

"لوانا، ایک بات کہوں"۔ اس کی نئی رَم این جنجر بھی آ چکی تھی۔ "مجھے اپنی ماتی کی ایک بات نہیں بھاتی۔ مچاکوس میں ہم ایک دوسرے سے ملتے تھے تو اس کا ننگا پنڈا دیکھ کر مجھے

---

[1] یورپی

معلوم ہوتا تھا کہ اس سے لپٹ کر میں نے اپنے گاؤں کی زرخیز مٹّی کو اپنے بدن پر مَل لیا ہے۔ پر اب یہ دُزدونگو کی گڑیا بن کے ہر دم کپڑوں میں ڈھنپی رہتی ہے ــــ تمہیں میری مائی ڈ پسند ہے نا بوانا؟ تم ــــ تم چاہو تو اسے لے لو ــــ!"

اچانک ڈانس فلور کی تیز و تُند دُھنیں اُچھل اُچھل کر میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

"اور بوانا، اپنی اس ــــ کیا نام ہے اس کا ــــ بینا کو مجھے دے دو۔ جب سے ملک کو آزادی ملی ہے، گورے رنگ سے لپٹنے کو ترس رہا ہوں۔"

ڈانس فلور پر اولڈ اینڈ نیو لوائز اپنی اپنی اولڈ اینڈ نیو گرلز کو ایک دوسرے سے بدل بدل کر والہانہ ناچ رہے تھے۔ میں نے نظر گھما کر بینا کی میز کی طرف دیکھا۔ افریقی ایگزیکٹو اپنی جگہ سے اُٹھ کر بینا کے پاس کھڑا تھا اور شاید اس سے درخواست کر رہا تھا۔ "میڈم، کیا آپ مجھے اپنے ساتھ ڈانس کرنے کا فخر بخشیں گی؟" اتنے موٹے موٹے افریقی ہونٹوں کا اتنا چھوٹا سا مہذب لہجہ کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

بینا نے مسکرا کر اپنا بازو ایگزیکٹو کے بازو پر ڈال دیا ہے۔ اب وہ اپنی جگہ سے چل پڑے ہیں۔ اب میرے قریب آ رہے ہیں۔ اب میرے قریب سے گزر جائیں گے۔ کیا ــــ کیا بینا میری طرف نظر اُٹھا کے کبھی نہ دیکھے گی؟ ــــ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی ہے ــــ!

"نہیں بوانا، نہیں!" میری اُلجھن کو بھانپ کر مکھامبا گویا ہوا۔ "تم بسکٹ بنانا بخوبی جانتے ہو لیکن عورت کو بالکل نہیں جانتے۔ تمہیں محبّت کرنا نہیں آتا بوانا، اس لئے وہ تمہیں نظر انداز کر رہی ہے۔ لاؤ، اپنی بینا کو مجھے دے دو۔ تمہاری طرف سے محبت کر کر کے میں اسے تمہارا دیوانہ بنا دوں گا۔"

میں خفا ہو کر مُرغ کی خشک ٹانگ چوسنے لگا۔

"کھامبا!" میں نے ماٹی کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔"مجھے تمہاری ماٹی بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

ماٹی اپنی کرسی سرکا کر میرے قریب آگئی۔

"تم میرے رفیقی[1] ہو بوانا" کھامبا نے بڑی نشہ آور معصومیت سے جواب دیا۔"میرے رفیقی کو میری سب بکریوں پر حق حاصل ہے۔ لو تم میری کالی بکری کی ڈوری تھامو اور میں اس سرنوڑ گوری بکری کو ڈور میں باندھ کر لاتا ہوں۔" وہ جھوم جھوم کر اٹھا اور فنانس منسٹری کے یورپی سیکرٹری کی میز کی طرف ہولیا جہاں اس کی بیٹی اپنے باپ سے ہٹ کر بیٹھی اس سے کھسر پھسر کر رہی تھی، شاید کہہ رہی تھی:" فادر اب کے لانگ لیو پر انگلینڈ گئے تو پھر نہیں لوٹیں گے۔ اب کوئی حال ہے یہاں رہنے کا؟"

ماٹی اور میرے قریب سرک آئی تھی۔

میں نے جی بھر کے اس کی طرف دیکھا اور اس کی بڑی مست، معصوم اور خوابناک آنکھوں میں جھانک کر مجھے محسوس ہوا کہ دھرتی کی زرخیز سیاہی پر رنگ برنگ پھولوں کا میلہ لگا ہوا ہے، یہ سیاہی سیاہ نہیں، صرف رنگوں کی افراط سے سیاہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں ہر رنگ ہے، ہر مہک ہے۔ یہ ثمر آور سیاہی رنگ و بو کا سرچشمہ ہے ــــ میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر میز کے نیچے اپنے گھٹنوں پر ٹکالیا، میری قوم، تہذیب، ذات، مذہب، رنگ، نام ــــ سب کچھ میرے ذہن سے محو ہو رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں مرد ہوں، آدم اور حوا کے سوا میں کسی اور عورت کو نہیں جانتا ــــ

ایکا ایکی مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے میری پشت سے مجھے بڑی ٹیڑھی نظر سے دیکھا ہے۔ میں نے مڑ کر ڈانس فلور کی طرف نظر کی جہاں سے بینا اپنے افریقی پارٹنر کے کندھے پر ٹھوڑی رکھے واقعی مجھے گھور رہی تھی۔ "چندو!۔۔۔ چندو!۔۔۔ چندو!

---

[1] دوست

اس کی آنکھیں مجھ سے مخاطب تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ جھگڑ کر ہمارا رشتہ گاڑھا ہو جائے گا مگر تم ـــــ تم میرے قابل نہیں ہو ـــــ نہیں ہو ـــــ!" بال کا آرکسٹرا تیز ہو گیا۔
"نہیں ہو! ـــــ"

میں نے اس کی طرف سے نظر ہٹا کر ماٹی کی طرف دیکھا، پھر اس کی طرف، پھر ماٹی کی طرف۔ "نہیں ہو ـــــ!"

میں ماٹی کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے ڈانس فلور پر آ گیا اور افریقی ایگزیکٹو کے منہ کی طرف اور بینا کی پشت پر تھا ناچ ناچ کر اشاروں اشاروں میں افریقی سے منت سماجت کی کہ بینا کو میرے بازوؤں میں ڈال کر سرک جائے۔ اس نے آقائی مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلایا اور ایک طرف سرک گیا۔ بینا نے اچانک اپنے آپ کو میرے بازوؤں میں پایا۔ آرکسٹرا کی دھنیں اور تیز ہو گئیں اور میں بینا کی کمر میں ہاتھ ڈالے تیز تر۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے نچا نچا کر نڈھال کر دوں اور وہ بے جان ہو کر سر اپنی مرضی سے میرے سینے پر ٹکا دے۔

ٹک ٹک۔ ٹاٹا۔ ٹا۔

ٹک ٹک۔ ٹاٹا۔ ٹا۔

مانو سب جانور اپنی خواہش سے بے چین ہو کر فرش پر دولتیاں مار رہے ہوں اور ان کی ایک ہی خواہش سے ان کی دولتیوں سے ایک ہی تال پیدا ہو گیا ہو۔

ٹک ٹک ٹاٹا۔ ٹا!

"ارے!" ڈانس ختم ہوتے ہی وہ میرا ہاتھ چھڑا کر اپنی میز کی طرف لوٹ گئی۔

"بینا!"

لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

محبت وحبت کے چکر میں میں آج تک نہیں پڑا۔ جہاں، جس پہ، جب تک دل

آگیا، آگیا اور بس۔ پر اب مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ بینا کی خفگی مجھے لے ڈوبے گی۔ شاید اس کی نیت خراب ہو اور وہ مجھے شادی کے جال میں پھانسنا چاہتی ہو ـــ مگر شادی کرنا اور گھر گرہستی سنبھالنا تو سنیاسیوں کا کام ہے، ہم دنیا والوں کو اس سے کیا غرض ؟

میں آہستہ آہستہ چل کر اپنی میز کی طرف آگیا ـــــــ

ملکھامبا بھی اپنی سیٹ پر لوٹ آیا تھا اور مانٹی کو اپنے ہاتھ سے شراب پلا رہا تھا۔

" مجھے افسوس ہے مس مانٹی " میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اس سے معذرت طلب کی۔ " میں تمہیں تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا ـــــ "

" میں بتاؤں لوانا، تم میری مانٹی کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے ؟ " ملکھامبا نے شراب کا گلاس میز پر پٹیک کر مجھے ٹوکا " اس لئے کہ وہ کالی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس گیلی گیلی کالی مٹی کی تہہ میں کتنی خوب صورت کائنات کے بیج پڑے ہوتے ہیں ـــــ وہ دیکھو ! "

اُس نے اچانک بینا کی طرف دیکھ کر اُدھر اشارہ کیا۔ وہ مُسکرا مُسکرا کر افریقی ایگریکلچوڑ کے ہونٹوں سے اس کا سگریٹ کھینچ رہی تھی " ہمارا طاقتور گہرا رنگ تمہارے کورے سفید کاغذ پر اس کا بھاؤ لکھ رہا ہے۔ تم سب کو، سب غیر ملکیوں کو اپنی اکاؤنٹس بُکس کے موٹے موٹے ہندسوں کی لکھت میں کالا رنگ بڑا پیارا لگتا ہے " بینا نے اپنی مُسکراہٹ کو گہرا کر کے اپنے افریقی ساتھی کی سگریٹ کو اپنے لبوں میں داب لیا تھا " اتنا پیارا کہ گھڑی دو گھڑی کے لئے تم اپنی گوری چیچی چاہ کو بھی بھول جاتے ہو "

" ملکھامبا ! "

" آہستہ بولو، لوانا " اس نے جنجر اور رم[1] کے گلاس سے مُنہ ہٹا کر جواب دیا ـــ " اس وقت تم میرے پاس نہیں ہو۔ جو بی[2] پیتے ہوئے ہم لوگ بسکٹ کے پیکٹ نہیں گنتے۔ اپنے مُونگو[3] سے باتیں کرتے ہیں "

---

[1] شراب [2] ... [3] خدا۔

"تم بہک رہے ہو میرے دوست"

"اسی لئے سچ بول رہا ہوں۔ تم میرے دوست نہیں ہو، دوست۔ اگر تم میری کالی بکری کو ذبح کر کے پیار سے مزے سے کھا بھی جاتے تو تم میرے دوست ہوتے، مگر ـــ"

"مائی، مجھے معاف کر دو پلیز، ورنہ یہ شیطان مجھے ہڑپ کر جائے گا۔" میں نے بڑی محبت سے پہلے مائی کی طرف دیکھا اور پھر مکھامبا کی طرف۔

مائی ہنسنے لگی اور اسے ہنستا دیکھ کر مکھامبا بھی، اور مجھے لگا کہ گھنگھور گھٹا پانی کی چھوٹی چھوٹی سفید بوندیں بن بن کر برسنے لگی ہے، اور میں بھی ہنسنے لگا اور پھر ہم سب اپنا اپنا گلاس منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بیک وقت کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"بوانا رفیقی،" مکھامبا مجھ سے کہنے لگا۔ "بس نیو ییئر تک حوصلہ رکھو، تمہاری بینا کو گفٹ پیکٹ میں سجا کر تمہیں پیش کروں گا، پر بوانا رفیقی، اس سے پہلے مجھے ذرا اس گوری چھوکری پیک کر لینے دو۔ چیٹے رنگ سے لپٹنے کی خواہش مجھے دم نہیں لینے دیتی بوانا۔"

"تم اس وزڈ و نگو لڑکی کے پاس گئے تھے؟" میں نے فنانس منسٹری کے یورپی سیکرٹری کی بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا بنا؟"

اس نے جواب دینے سے پہلے ہاؤس آف رام جی کے چھوٹے چھوٹے نمکین بسکٹوں کی ایک مٹھی منہ میں دھر لی۔

"بنا کیا تھا، میں نے لڑکی سے ناچنے کی درخواست کی اور جواب میں اس کا وہ پتھر باپ کہنے لگا کہ ڈاکٹر نے میری بیٹی کو ناچنے سے منع کر رکھا ہے ـــ"

"پھر ـــ؟"

"پھر میں نے اس سے کہا کہ تمہاری بیٹی ایک بار میری جڑی بوٹی چاٹ لے تو چوبیس گھنٹے گوما[1] کرتی پھرے ـــ"

---

[1] ایک بڑا تیز افریقی ناچ۔ ناچنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

میں اور ماٹی ہنس پڑے، جیسے آسمان میں قوسِ قزح کے دو رنگ بکجا ہو رہے ہوں، ان دو رنگوں کا بیاہ ہو رہا ہو اور دیکھتے دیکھتے یہ دو سات ہو جائیں۔

مکھامبا نے بسکٹوں کی ایک اور مٹھی منہ میں اُلٹ دی۔

"میری بات سُن کر دزونگو کے ماتھے پر کئی شکن اُبھر آئے اور منسٹر نے اپنی آنکھیں میچ کر مجھے وہاں سے سرک جانے کا اشارہ کیا۔"

"آؤ ماٹی ڈانس کریں۔"

"نہیں، تم مجھ پر ترس کھا کے کہہ رہے ہو۔" ماٹی نے بولنا شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ رات کی سیاہی میں کسی معصوم بچے نے پھلجڑی جلائی ہے۔ "جب تم اپنی خواہش سے بے تاب ہو کر مجھے کھینچ کر لے جاؤ گے تو میں تمہارے ساتھ ضرور ناچوں گی۔"

"ہاں" میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ "کالا رنگ کتنا پیارا اور گنجان ہوتا ہے۔ غموں، خوشیوں، مسکراہٹوں، چیخوں، آہوں اور آنسوؤں سے سر بسر آباد! سفیدی میں کبھی ہلکی سی گہرائی نہ ہو تو وہ خالی خولی رہے۔ گہرائی سے ہی سفیدی کے نقوش بنتے ہیں۔ کالے رنگ سے ہی زندگی کی تحریک و تخلیق ہوتی ہے ——" میں نے پلیٹ سے تھوڑا ڈرائی چکن اُٹھا کر ماٹی کے منہ میں ڈال دیا۔ ہمارے دنوں کی تاب راتوں کے پُربہار اندھیرے آنچل سے ہی ہے۔ میں نے محبت سے ماٹی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"رفیقی ——" مکھامبا اچانک بے چین ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تم میری ماٹی کا دل بہلاؤ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دزونگو کی سفید برف بیٹی سے آج ناچ کر ہی دم لوں گا۔" وہ اپنی کامیابی کے خیال سے خوش ہو ہو کر ہنسنے لگا۔ "بولو نا رفیقی، برف کو پہاڑ کی چوٹی سے اُٹھا کر پیار سے گرم گرم ہتھیلیوں میں لے لیا جائے تو وہ اپنے آپ پگھل جاتی ہے۔"

"چھوڑو اسے مکھامبا، بیٹھ جاؤ۔" اسے نشہ سے لڑکھڑاتا پا کر مجھے ڈر محسوس ہونے لگا کہ

وہ چیف گیسٹ کی ٹیبل پر جا کے گڑبڑ کریگا۔

"بوانا رفیقی، آج میں اپنی خواہش ضرور پوری کروں گا، خواہ اسے پورا کہنے ہوئے سب کچھ اُلٹ پلٹ جائے۔ بڑی پیاری عورت ہے، اتنی سفید، جتنا میری کالی گائے کا میٹھا دودھ۔"

"بیٹھ جاؤ نکھامبا!"

"نہیں اس وقت میں یہاں باس ہوں، تم بسکٹ کے ڈبے گنو۔ بوانا ادریس پروڈکشن ایڈمنسٹریشن کے لیے جاتا ہوں ——" چند قدم چل کر وہ واپس آگیا۔

"دیکھو، میرے اس چاکلیٹی بسکٹ کو راہ میں ڈال کر پھر اِدھر اُدھر نہیں ہولینا۔" اس نے ماٹی سے متعلق مجھے متنبہ کیا اور لڑکھڑا لڑکھڑا کر چیف گیسٹ کی ٹیبل کی جانب چلنے لگا۔

اس کے جانے کے بعد ماٹی میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ گویا پوچھ رہی ہو" کہو، کیا ارادہ ہے؟"

اور میری کائنات کے ابر آلود اُفق پر ہلچل ہونے لگی۔ ماٹی کی مسکراہٹیں ان بادلوں میں بجلی کی بے چین لکیروں کے مانند کوند رہی تھیں، حوّا کو پہلی بار گلے لگانے سے پہلے آدم کے دل و دماغ میں طوفان اُمڈ رہا تھا، دنیا بگڑ بگڑ کر سنور رہی تھی —— میں ماٹی کو کھینچ کر ڈانسنگ فلور پر لے آیا جہاں کئی مرد و زن انسان کے اوّلیں تمدن و ادراک سے سرشار ہو ہو کر افریقی فوک ڈانس گوما کی تیز و تند دھنوں پر ناچ رہے تھے۔

ماٹی کے بھرے بھرے سیاہ بازو اتنے کومل تھے کہ میں نے اپنی شدید اشتہا سے مغلوب ہو کر وہاں زور سے ایک چٹکی بھری۔ حوّا نے ایک لذت آفریں درد سے ذرا سا چیخ کر اپنی دائیں ٹانگ اُٹھائی، پھر بائیں، پھر دائیں —— اور ہم دونوں ناچنے لگے۔

اس کے ساتھ تیز تیز ناچ ناچ کر میرے جسم میں میری آبائی قوتیں لوٹنے لگیں اور مجھے محسوس ہوا کہ میری کمر کے نیچے بن مانس کی دُم برآمد ہو رہی ہے، میرے جسم پر بڑے بڑے بال اُگ

آسے ہیں اور میں اپنی ہم ذات مخلوق کو کچا کھا جانا چاہتا ہوں لیکن ایک جاندار عورت کے ساتھ بے تحاشا ناچ ناچ کر میرے وحشیانہ پن کو قرار آ رہا ہے میری بربریت تہذیب سے روشناس ہو رہی ہے۔

"میں تمہیں کیسی لگ رہی ہوں ؟"

"بڑی گوری، بڑی پیاری !" میں نے ماٹی سے کہا۔ "اور میں ؟"

"بڑا پیارا، بڑا کالا !"

ماٹی کی موٹی موٹی غزالی آنکھوں میں داخل ہو کر میں ایک نہایت گھنے جنگل میں نکل آیا اور افریقہ کے سب سے مہذب جانور ہاتھی کے مانند ایک چشمے کے کنارے سر جھکا کر اپنی پیاس بجھانے لگا۔

گو ما ختم ہونے پر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ چوپائے کی طرح ناچ ناچ کر مجھے انسان کے سب تعصبات سے نجات مل گئی ہے۔ ذات، تعلیم، رنگ ــ سب تعصبات سے، اور اس آزادی سے مجھے اپنا آبائی ورثہ میسر آ گیا ہے : قوت، زندگی کے آمنے سامنے ہو کر اسے سر کرنے کی اوّلیں قوت!

"ارے چیف گیسٹ کی میز پر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے ؟" میں اور ماٹی تیز تیز چل کر وہیں آ گئے۔

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔" افریقی منسٹر فار فنانس مکھامبا سے مخاطب تھا۔

"نہیں مفنے[1]" "میں اپنی خواہش پوری کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا، خواہ تم میرا خون پی جاؤ۔"

مکھامبا نشے میں دُھت تھا اور میز کے ایک کونے میں ایک کرسی پر ٹانگ رکھے اُن سب سے کہہ رہا تھا "میں مسٹر وارڈن سے پوچھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے کالے وزیر کے سفید سیکرٹری کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ اپنی بیٹی کو میرے ساتھ کیوں نہیں ناچنے دیتا ؟"

"تمہیں کئی بار بتایا جا چکا ہے کہ مس وارڈن کی صحت اس قابل نہیں۔"

"نہیں مفنے، تم سمجھتے ہو یا بنتے ہو، مسٹر وارڈن دراصل کسی کالے آدمی کو اپنی سفید

---

[1] کسی واجب التعظیم بزرگ کے لئے افریقی لفظ

وہ چیف گیسٹ کی ٹیبل پر جاکے گڑبڑ کریگا۔

"بوانا رفیقی، آج میں اپنی خواہش ضرور پوری کروں گا، خواہ اسے پورا کرتے ہوئے سب کچھ اُلٹ پلٹ جائے۔ بڑی پیاری عورت ہے، اتنی سفید، جتنا میری کالی گائے کا میٹھا دودھ۔"

"بیٹھ جاؤ نکھامبا!"

"نہیں اس وقت میں یہاں پاس ہوں، تم بسکٹ کے ڈبے گنو بوانا، ادریس پہ ڈڈکشن اینڈ منسٹریشن کے لیے جاتا ہوں ـــــ" چند قدم چل کر وہ واپس آگیا۔

"دیکھو، میرے اس چاکلیٹی بسکٹ کو راہ میں ڈال کر پھر اِدھر اُدھر نہیں ہو لینا۔" اس نے ماٹی سے متعلق مجھے متنبہ کیا اور لڑکھڑا لڑکھڑا کر چیف گیسٹ کی ٹیبل کی جانب چلنے لگا۔

اس کے جانے کے بعد ماٹی میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ گویا پوچھ رہی ہو" کہو، کیا ارادہ ہے؟"

اور میری کائنات کے ابرآلود اُفق پر ہلچل ہونے لگی۔ ماٹی کی مسکراہٹیں ان بادلوں میں بجلی کی بے چین لکیروں کے مانند کوندرہی تھیں، حوّا کو پہلی بار گلے لگانے سے پہلے آدم کے دل و دماغ میں طوفان اُمڈ رہا تھا، دنیا بگڑ بگڑ کر سنور رہی تھی ـــ میں ماٹی کو کھینچ کر ڈانسنگ فلور پر لے آیا جہاں کئی مرد و زن انسان کے اوّلیں تمدن و ادراک سے سرشار ہو ہو کر افریقی فوک ڈانس گوما کی تیز و تند دھنوں پر ناچ رہے تھے۔

ماٹی کے بھرے بھرے سیاہ بازو اتنے کومل تھے کہ میں نے اپنی شدید اشتہا سے مغلوب ہو کر وہاں زور سے ایک چٹکی بھری۔ حوّا نے ایک لذّت آفریں درد سے ذرا سا چیخ کر اپنی دائیں ٹانگ اُٹھائی، پھر بائیں، پھر دائیں ـــ اور ہم دونوں ناچنے لگے۔

اس کے ساتھ تیز تیز ناچ ناچ کر میرے جسم میں میری آبائی قوتیں لوٹنے لگیں اور مجھے محسوس ہوا کہ میری کمر کے نیچے بن مانس کی دُم برآمد ہو رہی ہے، میرے جسم پہ بڑے بڑے بال اُگ

آسکے ہیں اور میں اپنی ہم ذات مخلوق کو کچا کھا جانا چاہتا ہوں لیکن ایک جاندار عورت کے ساتھ بے تحاشا ناچ ناچ کر میرے وحشیانہ پن کو قرار آرہا ہے، میری بربریت تہذیب سے روشناس ہو رہی ہے۔

"میں تمہیں کیسی لگ رہی ہوں ؟"

"بڑی گوری، بڑی پیاری !" میں نے ماٹی سے کہا۔ "اور میں ؟"

"بڑا پیارا، بڑا کالا !"

ماٹی کی موٹی موٹی غزالی آنکھوں میں داخل ہو کر میں ایک نہایت گھنے جنگل میں نکل آیا اور افریقہ کے سب سے مہذب جانور ہاتھی کے مانند ایک چشمے کے کنارے سر جھکا کر اپنی پیاس بجھانے لگا۔

گو ما ختم ہونے پر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ چوپائے کی طرح ناچ ناچ کر مجھے انسان کے سب تعصبات سے نجات مل گئی ہے۔ ذات، تعلیم، رنگ ــــ سب تعصبات سے، اور اس آزادی سے مجھے اپنا آبائی ورثہ میسر آگیا ہے: قوت، زندگی کے آمنے سامنے ہو کر اسے سر کرنے کی اولین قوت!

"ارے چیف گیسٹ کی میز پر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے ؟" میں اور ماٹی تیز تیز چل کر وہیں آگئے۔

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔" افریقی منسٹر فار فنانس مکھامبا سے مخاطب تھا۔

"نہیں مضنے[1]" "میں اپنی خواہش پوری کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا، خواہ تم میرا خون پی جاؤ۔"

مکھامبا نشے میں دُھت تھا اور میز کے ایک کونے میں ایک کرسی پہ ٹانگ رکھے اُن سب سے کہہ رہا تھا "میں مسٹر وارڈن سے پوچھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے کالے وزیر کے سفید سیکرٹری کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ اپنی بیٹی کو میرے ساتھ کیوں نہیں ناچنے دیتا ؟"

"تمہیں کئی بار بتایا جا چکا ہے کہ مس وارڈن کی صحت اس قابل نہیں۔"

"نہیں مضنے، تم بھولے ہو یا بنتے ہو، مسٹر وارڈن دراصل کسی کالے آدمی کو اپنی سفید

---

[1] کسی واجب التعظیم بزرگ کے لئے افریقی لفظ

بیٹی کے قابل نہیں سمجھتا۔"

"چلو یونہی سہی۔"

"لیکن مضے، مَیں اتنے سال اپنی آزادی کے لئے اس وزنڈنگو سے لڑتا رہا کہ میں اپنے آپ کو ہر عورت کے قابل سمجھتا ہوں۔"

"میں تمہیں شوٹ کروا دوں گا۔" کالے وزیر نے دھمکی دی۔

"اچھا مضے، یہ نہیں تو کوئی اور سفید لڑکی دلوا دو۔ اگر آج مجھے کوئی گوری لڑکی نہ ملی تو میں پھانسی لے کر مر جاؤں گا۔"

"مسٹر مکھامبا، پلیز۔۔۔!" رام جی نے اپنے نوکر سے التجا کی۔

"بوانا رام جی، تم ہی مان جاؤ۔ تمہاری بیٹا بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

میں نے اسے کھینچ کر وہاں سے لے جانا چاہا لیکن اس نے مجھے پرے دھکیل دیا۔

"تم۔۔۔تم خدا کے نیک بندے نہیں۔" قریب ہی بیٹھے ایک یورپی مشنری نے اپنا لائم جوس کا گلاس پرے جھٹک کر غصے سے کہا۔ "تم شیطان کے پیروکار ہو!" اس نے اپنا جملہ کہہ کر ہاتھوں کو کراس کا نشان بنانے کے انداز میں ہلایا۔

مکھامبا ہنسنے لگا۔

"ہاں، میں شیطان کا پیروکار ہوں۔ شیطان میرا گہرا دوست ہے۔"

"گہرا دوست؟" حالانکہ افریقی وزیر مصلحتاً بات کو فوراً ختم کرنا چاہتا تھا لیکن وہ مکھامبا کے جواب میں دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکا۔ "وہ کیونکر؟"

"وہ یوں مضے، کہ ان سفید لوگوں کی مقدس تصویروں میں شیطان میرا ہم رنگ ہے، روسیاہ!"

رضیہ سجّاد ظہیر

پڑوسی

بیگم رفیق اپنے مہمان کو رخصت کرکے ڈرائنگ روم کا جالی دار دروازہ بند کر رہی تھیں کہ پھاٹک سے ریحانہ آتی دکھائی دی:

"افوہ یہ پھر آگئیں" بیگم رفیق بڑبڑائیں "بھئی اچھی مصیبت ہے۔ ذرا کسی سے اخلاق سے ملو اور وہ سر ہی پر سوار ہوا جاتا ہے۔ نہ ملو تو مغرور اور بد دماغ کہلاؤ۔ نہ جانے لوگ اپنی جگہ کیوں بھول جاتے ہیں اور اپنے آپ کو کیوں اس قدر دلچسپ سمجھتے ہیں" جھنجھناتی ہوئی وہ اندر چلی گئیں۔

ریحانہ برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھ آئی۔ ہاتھ بڑھا کر گھنٹی کا بٹن دبایا اور کسی کے نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔ برآمدے میں رکھی ہوئی آئینہ لگی ٹوپی کی کھونٹی میں اس کا سینہ اور گردن کا حصہ نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی دھلی ہوئی سوتی ساڑی کا لپیٹ ٹھیک کیا اور پہلو بدل کے پھر انتظار کرنے لگی۔ ایک چھوٹا سا بھورے رنگ کا کتا ڈرائنگ روم کے دروازے کو منہ سے کھول کر باہر نکلا۔ ریحانہ کو دیکھ کر اس نے دو ایک مرتبہ دم ہلائی، اور پھر چکر کاٹ کر چمکتی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر اُچک کر چڑھ گیا۔ وہاں سے اس نے منہ بڑھا کر بید کی میز پر رکھی ہوئی راکھ دانی کو دو ایک بار سونگھا اور پھر کرسی کے تکیے میں منہ چھپا لیا۔ ریحانہ نے ہاتھ بڑھا کر پھر گھنٹی بجائی۔ ایک منٹ بعد بیگم رفیق خود نکلیں۔ ریحانہ نے انھیں سلام کیا اور وہ ریحانہ کو دیکھ کر یوں مسکرائیں گویا اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ "آیئے آیئے کئی دن بعد آئیں آپ۔ آیئے بیٹھیے"

ریحانہ ادب سے آگے بڑھی اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "میرے ابّا جان کا

خط آیا ہے وہ آپ لوگوں کو جانتے ہیں۔ دیکھئے بات یہ ہے کہ میں نے ان کو لکھا تھا کہ آپ ہماری خوش قسمتی سے ہمارے پڑوس میں آ گئی ہیں تو انھوں نے لکھا کہ وہ بھی آپ لوگوں کو جانتے ہیں۔"

بیگم رفیق نے اس درمیان میں کتے کو دوسری کرسی سے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا تھا۔ اس کے گال سہلاتے ہوئے بولیں۔" اچھا، وہ ہم لوگوں کو کہاں سے جانتے ہیں؟"

" جی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب وہ نجیب آباد میں پرائمری اسکول میں ٹیچر تھے تو انھوں نے آپ کے کسی بھائی کو پڑھایا تھا۔ اشرف صدیق نام تھا۔"

" ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میرے سب سے چھوٹے بھائی کا نام اشرف ہے۔ اسوقت ابا جان نجیب آباد میں ڈی، ایم تھے۔ انگلش اسکول وہاں کوئی تھا نہیں اور بھیا کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ اس لئے کہیں بورڈنگ میں ڈالنے کے بجائے سوچا کہ کچھ دنوں کی بات ہے یہاں پرائمری میں ہی سہی۔ تو آپ لوگ نجیب آباد........."

" جی ہاں، اصل رہنے والے تو ہم لوگ وہیں کے ہیں۔ میرا مطلب ہے میرے ابا کے خاندان والے۔ میرے ابا نے لکھا ہے کہ وہ آپ کی شادی میں بھی شریک ہوئے تھے اور مجھ سے بھی کہا ہے کہ آپ لوگوں کی کچھ خدمت کر سکوں تو ضرور کروں۔ تو اب آپ کو میرے لائق خدمت ضرور ہی بتانی پڑے گی۔"

" لیجئے۔ اب اور آپ کیا کریں گی؟ جب سے ہم پڑوس میں آئے ہیں مسلسل تو آپ کو طرح طرح کے کاموں کے لئے پریشان کرتے رہتے ہیں......." بیگم رفیق کتے کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

" جی نہیں۔ ہم نے بھلا آپ کے لئے کیا کیا۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ کس لائق ہیں؟" ریحانہ نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر خوشی کا گلابی پن ناچنے لگا تھا۔ بیگم رفیق کتنی اچھی تھیں جو اس سے اتنی محبت سے ملتی تھیں۔ غرور تو ان کو چھو نہیں گیا تھا۔ ورنہ بھلا آئی سی ایس افسروں کی

بیویاں کہیں کلرکوں کی بیویوں سے اس طرح اخلاق سے پیش آتی ہیں۔ وہ چلنے کیلئے کھڑی ہوئی تو بیگم رفیق نے آہستہ سے پوچھا" کچھ پیتی تو جایئے۔ لیمن، اسکوائش، چائے"
"شکریہ! سب آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ مجیب صاحب عارف کو لے کر سرکس گئے ہیں، تین بجے والے شو میں، اس لئے میں نے اسی وقت ان کے لئے چائے بنا دی تھی تو خود بھی پی تھی۔" جب ریحانہ سیڑھیاں اترنے لگی تو بیگم رفیق بولیں "وہ بجلی کی استری جو آپ نے بھجوائی تھی اس کو ذرا پھر بھجوا دیجئے گا۔"

"بہت اچھا! ضرور بھجوا دوں گی اور وہ پھل والا آیا تھا میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ کے یہاں ہو لے۔"

"ہاں آیا تو تھا لیکن اس کے پاس اچھے پھل نہیں رہتے ہم تو فروٹ مارٹ سے لے آتے ہیں۔"

"فروٹ مارٹ میں پھل بڑے مہنگے ملتے ہیں۔" ریحانہ نے نچلی سیڑھی پر کھڑے کھڑے جواب دیا۔" اور یہ لوگ جو منڈی سے لاتے ہیں اور گھوم گھوم کے بیچتے ہیں تو ذرا سستا دیتے ہیں۔"

بیگم رفیق کو اس مہنگے سستے کے ذکر سے کوفت ہونے لگی۔ خاص کر لفظ منڈی سے تو ان کو بہت ہی چڑ تھی۔ زندگی میں ایک بار وہ غلطی سے منڈی چلی گئی تھیں تو پھر وہاں کی بھیڑ، گھٹن اور گندگی سے ان کا سر دن بھر چکراتا رہا تھا اور نہ جانے کتنا اور رہتا۔ ڈی کولون لگانے کے بعد جا کے ٹھیک ہوا تھا۔ ریحانہ کی اس بات کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اوپر کی سیڑھی پر کھڑی کتے کو گود میں لئے سہلاتی رہیں۔ ریحانہ شاید کچھ اور کہتی لیکن اسی وقت ایک موٹر تیزی سے پھاٹک میں داخل ہوئی، زن سے سیڑھیوں کے نزدیک رک گئی۔ اور رفیق صاحب اترے؛ ریحانہ نے انھیں دیکھ کر آنچل سے سر ڈھک لیا اور سلام کر کے سر جھکائے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

رفیق صاحب نے چائے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "ڈارلنگ! یہ کون ہیں جو ابھی نکل کے گئیں؟ ان کو میں نے اس دن تمھارے بڈروم میں بھی بیٹھے دیکھا تھا جس دن تمھیں بخار آ گیا تھا۔"

"یہ مجیب صاحب کی بیوی ہیں! ارے یہی مجیب کلرک جو یہاں پڑوس میں رہتے ہیں۔ کیوں؟" بیگم رفیق نے ذرا غور سے اپنے میاں کی طرف دیکھا، ریحانہ کی بھولی بھالی تمکین صورت اور جوان سڈول جسم ان کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔ شوہر کی نظریں بچا کر انھوں نے سامنے برتنوں کی الماری میں لگے ہوئے آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور پھر شوہر کی طرف دیکھنے لگیں

رفیق صاحب بسکٹ پر جیلی اور مکھن لگاتے ہوئے بولے۔ "کچھ نہیں۔ مگر بھئی ذرا ہر ایک سے بے تکلفی بڑھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اپنی بھولنے کی عادت کو تم جانتی ہی ہو اور بھولنے کا کیا ہے۔ گھر میں آخر ہر چیز میں تو تالا نہیں لگایا جا سکتا۔"

بیگم رفیق نے ایک اطمینان کا سانس لیا اور ان سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلانے لگیں۔

رفیق صاحب نے کرسی پر پہلو بدلا اور بولے۔ "دیکھو میں کسی کو چور بے ایمان نہیں سمجھتا یا کسی پر الزام نہیں لگا رہا لیکن احتیاط یوں لازمی ہے کہ زمانہ خراب ہے۔ مالی پریشانیوں سے تنگ آ کر شریف بھی بعض وقت ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جو معمولی طریقے سے شاید نہ کرتے۔"

"ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" بیگم رفیق نے سر ہلایا۔ "اصل میں میں نے صرف اس لیے نہیں ٹوکا کہ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ مغرور ہیں، ویسے اس دن جو وہ بیڈروم میں چلی آئی تھیں تو مجھے بھی اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ اصرار کرتی رہیں کہ لائیے آپ کے سر میں بام مل دوں، آپ درد سے بہت پریشان ہیں۔" پھر ذرا

رک کے بولیں "ہاں — بام ڈھونڈنے کے لئے انھوں نے میری سنگھار میز کی درازیں کھولی تھیں"

جب رفیق صاحب چائے کی میز سے اُٹھنے لگے تو بیگم رفیق آہستہ سے بولیں۔

"وہ اس دن آئی تھیں تو کہتی تھیں کہ ٹوبی کے واسطے کوئی ٹیوٹر نہ رکھئے — میں پڑھا دیا کروں گی۔ دن میں خالی رہتی ہوں۔ انٹرمیڈیٹ تک پڑھتی ہیں۔"

"کیا لیں گی؟" رفیق صاحب نے پوچھا۔

"لینے کو تو انھوں نے منع کر دیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کو کسی اور طرح کچھ دے دیا جائے گا۔"

"جیسا مناسب سمجھو۔"

چنانچہ اس دن ریحانہ باہر برآمدے میں بیٹھی ٹوبی کو اے۔ بی۔ سی۔ ڈی پڑھانے کے بعد کہانی سنا رہی تھی کہ ڈرائنگ روم سے بیگم رفیق نکلیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک انگوری رنگ کی جارجٹ کی ساری تھی جس کے نیچے سیاہ پھولدار حاشیہ بنا ہوا بہت خوبصورت لگ رہا تھا "دیکھئے یہ ساری کیسی ہے؟" انھوں نے ریحانہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ریحانہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دینے لگی "بہت پیاری ہے — بہت اچھی ہے۔" اس نے ساری پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کہاں سے لی آپ نے؟"

"لیڈیز اسٹور سے"

"کتنے کی ہے؟" ریحانہ نے پوچھا۔

بیگم رفیق کو پھر کوفت ہونے لگی۔ ریحانہ ہر چیز کے بارے میں یہ ضرور پوچھتی تھی کہ کتنے کی ہے۔ کوالٹی کا تو اسے کبھی خیال آتا ہی نہیں تھا۔ خیر کوفت کو ضبط کر کے بولیں "زیادہ قیمت نہیں ہے۔ اٹھارہ یا بیس کی ہو گی"

"اس کے پاس اسی رنگ اور ڈیزائن کی اور ساریاں ہیں؟" ریحانہ نے پوچھا۔

مجھے انگوری رنگ بہت پسند ہے اور یہ بارڈر تو اس کے ساتھ بہت ہی اچھا لگ رہا ہے، بالکل ایسے ہی بارڈر والی اسی رنگ کی ایک اور مل جائے تو ہم بھی لیں گے۔"

"ہاں ہاں، مل جائے گی ابھی اس کے پاس کئی ہیں۔" بیگم رفیق بولیں۔

"تو ہم لیں گے۔ ہمارے ابا نے عید پر کچھ روپئے بھیجے ہیں۔" ریحانہ نے خوش ہو کے جواب دیا۔ بیگم رفیق اندر چلی گئیں اور پھر وہ ٹوبی کو کہانی سنانے لگی۔

اس دن بیگم رفیق کو کئی کاموں سے بازار جانا تھا۔ جس میں ایک ضروری کام یہ بھی تھا کہ اس انگوری ساری کو رفو کے لئے دینا تھا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ پچھلی رات کو وہ اسے پہن کر کہیں ڈنر پر گئی تھیں اور موٹر سے اترتے وقت وہ اس بری طرح پاؤں میں الجھی کہ ایک جگہ سے چر گئی۔ وہ تو کہئے کہ بھلا ہوا کہ رات کا وقت تھا اور بیگم رفیق اس پھٹے ہوئے حصے کو ساری کی باقی پلیٹوں میں چھپا لینے میں کامیاب ہوگئیں۔ ورنہ بڑی بھد ہوتی۔ انھوں نے ساری لپیٹنے کے لئے اخبار اٹھایا۔ یکایک ان کی نظر اخبار میں لکھی ہوئی ایک خبر پر پڑی جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ کس طرح ایک غریب پڑوسی نے دوستی کر کے امیر پڑوسی کے سارے زیورات پار کر دیئے۔ خبر پڑھتے ہی انھیں ریحانہ کا خیال آیا اور اپنے شوہر کی باتیں کانوں گونجنے لگیں۔ انھوں نے اخبار رکھ دیا اور سنگار میز پر سے شاپنگ کی فہرست اٹھائی۔ ابھی انھیں بہت کام نپٹانے تھے، خانساماں کو جنس دینی تھی۔ شام کی چائے پر آنے والے مہمانوں کے واسطے کچھ بنانے کے لئے بھی کہنا تھا اور ساری کے علاوہ بھی کچھ کپڑے لپیٹنے تھے جو لانڈری اور رفوگر کے یہاں دینے تھے۔

وہ جلدی جلدی سب چیزیں کاغذ میں لپیٹ رہی تھیں کہ یکایک پہلے گھنٹی کی آواز آئی۔ پھر ریحانہ بیڈ روم کا پردہ اٹھا کر اندر آ گئی اور مسکرا کے بولی "یہ آپ کا خط ڈاکیہ ہمارے یہاں ڈال گیا تھا۔" بیگم رفیق نے خط لے لیا، اس سے بیٹھنے کو

کہتے ہوئے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر دوسری طرف سرکا دیا اور پھر پلنگ پر بیٹھ کر کپڑے وغیرہ بازار کے تھیلے میں رکھنے لگیں۔ ریحانہ بھی اسی پلنگ پر بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ جب سب چیزیں تھیلے میں بھر گئیں تو بیگم رفیق اٹھیں ریحانہ بھی اٹھی۔ دونوں باہر نکلیں۔ ریحانہ سلام کر کے باہر چلی گئی اور بیگم رفیق پچھلے برآمدے میں جا کر خانساماں کو چائے کے لئے ہدایتیں دینے لگیں۔ واپس آکر انھوں نے رفیق صاحب کو موٹر کے لئے ٹیلیفون کیا۔ دفتر سے بڑے بابو نے جواب دیا کہ وہ کسی ضروری کام سے کہیں گئے ہیں، اور معلوم نہیں کب لوٹیں گے۔ بیگم رفیق نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور بس سے جانے سے ارادہ سے نکل کھڑی ہوئیں۔

ٹاؤن گھنٹہ گھر ایک بجا رہا تھا۔ بیگم رفیق اپنی تمام شاپنگ کر چکی تھیں۔ تھیلا طرح طرح کی چیزوں سے اٹم اٹ بھرا تھا۔ صرف وہ ساری رفو کرنے کے لئے دینی باقی تھی اور اس لئے وہ صدر جانے والی بس کے اڈے پر کھڑی تھیں۔ صدر سے ان کا ارادہ تھا کہ رکشے سے گھر چلی جائیں گی۔ لیکن اس وقت کے انتظار میں چند منٹ آسانی سے خرچ کئے جا سکتے تھے کیونکہ صاحب دو بجے سے پہلے لنچ کے لئے نہیں آتے تھے۔ بس کے اڈے کے پاس ہی ایک بڑی خوبصورت چھوٹی سی دکان جوتوں اور بٹوؤں کی تھی بیگم رفیق بس کا انتظار کرتے کرتے دکان کے شیشوں میں دیکھنے لگیں۔ بعض بعض بٹوے بڑے ہی خوبصورت تھے۔ یکایک کسی نے پیچھے سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مڑیں تو ریحانہ ہاتھ میں شاپنگ کا تھیلا لئے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ویسے ہی بس آگئی۔ دونوں جلدی جلدی سوار ہوئیں۔ اندر جگہ کافی تھی آگے جا کر لیڈیز سیٹ پر دونوں بیٹھ گئیں۔ تھیلے پاؤں کے پاس رکھ دیئے۔

آگے والی سیٹ پر بیگم رفیق کے سامنے ایک دیہاتی عورت میلی کالی ساری باندھے بیٹھی تھی۔ اس کا بچہ کندھے سے لگا سو رہا تھا۔ بچہ کی ناک اور آنکھیں

بہت ہی گندی نفیس۔ بیگم رفیق نے تیوری چڑھا کر بس کی کھڑکی کی طرف منھ کر لیا اور تازہ ہوا میں سانس لینے لگیں۔ ریحانہ اس بات کو بھانپ کر جھکی اور اپنے تھیلے میں کچھ ٹٹولنے لگی اور بڑی تلاش کے بعد چائے کے بنڈل، شکر، مصالحوں کی پڑیوں اور دوسرے بنڈلوں کے نیچے الائچی کی پڑیہ ملی۔ اس نے ایک الائچی اپنے منھ میں رکھی اور ایک بیگم رفیق کی طرف بڑھائی، انھوں نے منھ موڑے بغیر الائچی لے لی اور آہستہ آہستہ اسے چبانے لگیں۔

بس ایک اڈے پر رُکی۔ دو تین لڑکیاں آکر پاس والی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ بس روانہ ہوئی تو بیگم رفیق کو چھینک آئی۔ وہ چھینک کر اپنے تھیلے میں رومال ڈھونڈنے لگیں۔ اور یکایک ان کے پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ تھیلے سے ان کی ساری غائب تھی۔ جھکے جھکے ساری چیزیں الٹ پلٹ کرنے کے بعد یکایک ان کی نظر ریحانہ کے تھیلے پر گئی اور جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ ان کی ساری ریحانہ کے تھیلے میں رکھی تھی۔ اسی طرح اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی۔ کس مزے سے اس نے جھک کر وہ ساری ان کے تھیلے سے نکال لی تھی۔ اور پھر لطف یہ کہ ان کو الائچی دے کر بیوقوف بھی بنایا تھا۔ غصہ کے مارے ان کا جسم کانپنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ وہیں بس میں تمام آدمیوں کے سامنے اس کی چُٹیا پکڑ کر اتنی جوتیاں ماریں کہ بھیجہ نکل جائے۔ ڈائن کہیں کی، صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے۔ آخر مرد ہیں نا۔ ہزاروں کو جانتے پرکھتے ہیں۔ اسی لئے آج صبح خط کا بہانہ بنا کر میرے بیڈروم میں گھس آئی! جھوٹی سارے زمانے کی اور بنتی کتنی شریف تھی۔ انھوں نے کنکھیوں سے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے بڑے شوق سے باتیں کرنے میں مصروف تھی ——

"ہاں ہاں جب آپ بس میں آئیں تبھی مجھے خیال ہوا کہ آپ خورشید کی بہن یا کوئی نہ کوئی عزیزہ ہیں آپ کی شکل خورشید سے کس قدر ملتی ہے۔"

"خورشید ہمارے ساتھ انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایر میں پڑھتی تھی پھر اس کی شادی

ہوگئی تھی۔ اچھّا دو بجّے ہیں۔ اچھا اس سے میرا بہت بہت سلام کہئے گا۔ بس کہدیجئے گا کہ وہ ریحانہ جو تمھارے ساتھ فرسٹ ایر میں پڑھتی تھی اس نے بہت بہت یاد کیا ہے، اور جو ان کی ان کی خالہ زاد بہن تھیں سانولی سی ذرا...... وہ اب آجکل کہاں ہیں......"

بیگم رفیق نے دھیرے سے ہاتھ بڑھایا اور ساری ریحانہ کے تھیلے سے ان کے تھیلے میں پہنچی ہی تھی کہ بس ایک جھٹکے کے ساتھ کسی اڈے پر رک گئی۔ کئی لوگ اترنے لگے۔ بیگم رفیق بھی اسی گڑبڑ میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنا تھیلا اٹھایا اور ریحانہ کے سلام کا جواب دئے بغیر گردن اٹھائے سینہ تانے اتر گئیں۔ غصہ کے مارے ان کے حواس بجا نہیں تھے فوراً ایک رکشا کی اور گھر کی طرف روانہ ہوگئیں۔ پہلے زور سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ پھر دھڑام سے بیڈ روم کا، تھیلا کرسی پر پھینکا اور پسینہ پونچھنے لگیں۔ "حد ہوگئی ایک طرف اتنی دوستی جتانا، شرافت دکھانا، ہمدرد بننا اور دوسری طرف چوری اور وہ بھی یوں آنکھوں میں دھول جھونک کر، سامنے سے، پاس بیٹھے ہوئے کمال ہے" زور سے انھوں نے تکیہ اٹھا کر دوسرے پلنگ پر پھینکا اور وہ جہاں کھڑی تھیں وہیں جمی کی جمی رہ گئیں۔ تکیہ کے نیچے ان کی اپنی ساری رکھی تھی اور پاس وہ اخبار جس میں یہ خبر اوپر ہی سے جھانک کر ان کا منہ چڑا رہی تھی کہ ایک پڑوسی نے دوسرے پڑوسی کو لوٹ لیا۔

اوم پرکاش بجاج

شطرنج کے مُہرے

زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں نے شمشیر بہادر کو قائل کر دیا تھا کہ زندگی شطرنج کی بازی ہے اور شطرنج کی بازی وہی جیت سکتا ہے جو ٹھیک وقت پر ٹھیک چال چلے' ورنہ ماضی کی محرومیوں کا رونا روتے روتے اور مستقبل کے سپنوں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند کر لینا تو زندگی کے ہاتھوں کھُلی مات کھانا ہے۔ زندگی کے بارے میں شطرنج کی بازی کے عقیدے کو شمشیر بہادر نے اپنا ایمان بنا لیا تھا۔ کیونکہ اُس نے بارہا دیکھا تھا جو لوگ وقت کی پرواہ نہیں کرتے' وقت ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ زندگی انھیں ہی سب کچھ دیتی ہے جو مستعدی سے اُسے مات دیتے ہیں اُن کو نہیں' جو تقدیر کے چمتکار کا انتظار کرتے ہیں۔

شمشیر بہادر اپنی زندگی کو المیہ نہیں بنانا چاہتا تھا' اس لئے اُس نے زندگی کے ہر اُس موقع سے فائدہ اُٹھایا جو وقت نے اُسے دیا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ ہوشیار نہ تھا۔ محنت کے باوجود وہ میٹرک میں دو بار فیل ہو گیا تھا۔ پھر اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ میٹرک پاس نہیں کر سکتا۔ اس لئے اُس نے آسان راستہ چُنا اور میٹرک کا جعلی سرٹیفکیٹ چار سو روپے میں حاصل کر لیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اُس کے ساتھی مزید تعلیم کے لئے کالجوں میں چلے گئے' لیکن اُس نے وہی ہرے رنگ کا پٹہ کھیل کر ایک انگریز افسر کی

بیوی کی وساطت سے دلّی کے ایک سرکاری ادارے میں کلرک کی نوکری حاصل کرلی۔

زندگی کے ابتدائی دور کی کامیابیوں نے اُس کے ذہن میں یہ احساس بسا دیا تھا کہ یہ زندگی اُسی کی ہے جو اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کی خاطر لوگوں سے چھینا جھپٹی کرتے ہیں، جو محض ایسے لوگوں سے تعلقات رکھتے ہیں جن سے انھیں کچھ ملنے کی توقع ہو، باقی رشتے ناطے تو محض دکھاوا ہیں، نری وقت کی بربادی۔ اسی اصول کو مدِّنظر رکھ کر شمشیر بہادر نے اپنے پتاجی کو زندگی بھر نہیں پوچھا۔ البتّہ آخری دِنوں میں جب وہ سخت بیمار تھے، ان کی بے حد خدمت کی۔ بھائیوں میں اُس کا نمبر تیسرا تھا، لیکن وہ ان سب کو پھلانگ کر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دن رات جاگ کر باپ کی وہ خدمت کی کہ دوسرے بھائی پیچھے رہ گئے اور مرنے والا سب کچھ اُسے دے کر چلا گیا۔

دولت، نوکری اور کچھ جھوٹ کی چمک دمک نے اُس کی شادی بھی ایک امیر گھرانے میں کرادی۔ لڑکی خوب صورت تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ جہیز میں ڈھیروں تحفے اور سامان لے کر آئی تھی۔ اُس نے شمشیر بہادر کی زندگی میں پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔ اب اُس کی زندگی میں کیا نہ تھا۔ دولت تھی، خوب صورت بیوی تھی، اچھا مکان تھا، اتنی چھوٹی عمر میں زندگی کی ہر خوبصورتی اُسے حاصل تھی۔

لیکن اس کی لوبھی خصلت ابھی دھن دولت سے سیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ موجودہ دولت کو محض رکھنا نہیں چاہتا تھا، بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا اصول اب صرف پیسہ تھا۔ یہی اُس کا ذہن تھا، یہی اُس کا دل، یہی اس کی پوری زندگی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی میں ہر شخص کی قیمت لگاتا اور موقع آنے پر اُس سے اپنی قیمت وصول کرنے سے نہ چوکتا۔ اتفاقاً اُس کی ہر چال ٹھیک بیٹھتی جس سے اُس کے عقیدوں کو اور تقویت ملتی۔

شمشیر بہادر کے اولاد بھی زیادہ نہ تھی۔ بس دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا
وِنّی باپ کی طرح خوش پوش اور چرب زبان تھا۔ باپ کی طرح ہی وہ شیخی بگھارتا رہتا۔
اُسے پڑھائی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بہت مشکل سے اُس نے تھرڈ ڈیویژن میں میٹرک
پاس کیا تھا اور باپ کے اثر و رسوخ سے ایک سرکاری دفتر میں معمولی نوکری پر اُس کا
تقرر ہو گیا۔

پچھلے کئی مہینوں سے شمشیر بہادر کے ایک دوست منسا رام کے کویت سے خط پر خط
آرہے تھے۔ ان خطوں میں اُس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں بھارت
آنا چاہتا ہے۔ اور کیوں کہ شمشیر بہادر دلّی میں ہے اور کافی بارسوخ ہے اس لئے وہ
اپنی لڑکی کی شادی کے معاملے میں اس کی مدد کا طلب گار ہے۔ لیکن شمشیر بہادر نے
اپنے دوست منسا رام کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ منسا رام درمیانہ
طبقہ کا ایک معمولی آدمی ہے۔ اگر وہ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں دلّی آئے گا تو
اُس کے یہاں ٹھہرے گا، اس کی مدد لے گا، اس سے اُدھار مانگے گا۔ وہ کوئی ایسا سودا
نہیں کرنا چاہتا تھا، جس سے اُسے کسی طرح کا نقصان ہو۔ اُس کا گھر سرائے یا
دھرم شالہ تو نہیں۔ اِسی لئے وہ جان بوجھ کر خاموش رہا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کا
دوست خط لکھتے لکھتے خود ہی تنگ آجائے گا۔ اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے گا۔

لیکن ایک شام جب وہ دفتر سے لوٹا تو اُس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔
منسا رام اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ آپہونچا تھا۔ . . . . اور وہ قلاش نہ تھا۔
وہ بیحد شاندار لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی بیوی کی کلائیوں میں درجن درجن بھر
سونے کی چوڑیاں دمک رہی تھیں۔ اُس کے گلے میں جواہرات کا نیکلس تھا۔ اپنے
تصور میں وہ جنہیں چیتھڑوں میں ملبوس دیکھ رہا تھا، وہ ریشم میں لدے ہوئے تھے۔
منسا رام، جسے وہ مدقوق اور مکروہ سمجھے ہوئے تھا، پھول کر کپّا ہو گیا تھا۔ اُن کے

چہرے پر سُرخی ناچ رہی تھی۔ آنکھوں میں جلال تھا۔ اُس کی لڑکی بے حد دل کش تھی۔ منسارام اور اُس کی بیوی اور لڑکی کی ظاہری حالت نے شمشیر بہادر کو اپنا پرانا تصور بھلانے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ جب منسارام نے شکوہ کیا کہ کیا بات تھی کہ اُس نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا تو شمشیر بہادر صاف جھوٹ بول گیا۔

"کیسے خط؟" شمشیر بہادر نے بناوٹی حیرانی سے جواب دیا۔

"بھیّا میں نے تمھیں دس خط لکھے تھے لیکن ......"

"میں بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے تمھارا ایک خط نہیں ملا۔ اگر ملتا تو کیا میں جواب نہ دیتا؟" شمشیر بہادر نے اُلٹا اپنے چہرے پہ ایسا کرب پیدا کیا جیسے جھوٹ کا الزام لگائے جانے پر سچے آدمی کے چہرے پر پیدا ہوتا ہے۔

اور پھر دونوں دوست باتیں کرتے رہے۔ بچپن کی باتیں، گاؤں کی باتیں کویت کی باتیں، دھن کی باتیں، دلّی کی باتیں۔ شمشیر بہادر کا اپنے دوست کے تئیں وطیرہ اب نیا روپ اختیار کر گیا۔ اس کا روکھا پن حلیمی میں ڈھل گیا، بے رُخی خاطر تواضع میں بدل گئی۔ سارا کنبہ مہمانوں کی خدمت میں جُٹ گیا۔ شمشیر بہادر نے دفتر سے چھٹی لے لی تاکہ اپنے دوست کی لڑکی کے لئے اچھا سا لڑکا ڈھونڈ سکے۔ اخبار میں اشتہار بھی دے دیا۔ چند دن کے بعد اچھے اچھے کئی رشتے آنے لگے۔ منسارام اور شمشیر بہادر اس سلسلے میں دن رات گھوم رہے تھے۔ منسارام کو ایک دو لڑکے بہت پسند آئے۔ لیکن شمشیر بہادر ہر لڑکے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا تھا۔ اس لئے بات وہیں رہ جاتی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ منسارام کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اس لئے وہ اپنی لڑکی کی شادی کے لئے بے قرار تھا۔ لیکن وہ شمشیر بہادر کے خلوص پر شک نہیں کر سکتا تھا اور اس کی خواہش کے خلاف نہ چل سکتا تھا۔ اس لئے وہ اپنی بے قراری کو جبراً دبائے رہا۔

دن گزرتے رہے۔ شمشیر بہادر، بدستور منسارام کو لڑکے دکھائے جا رہا تھا اور انھیں ناپسند کئے جا رہا تھا۔ شمشیر بہادر کی ناپسندیدگی کے پسِ پُشت ایک راز تھا۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ نیرا سے اپنے لڑکے کی شادی کرے گا۔ اور وہ تمام قیمتی کپڑے اور زیورات حاصل کرے گا جو منسارام دس بکسوں میں بھر کر ساتھ لایا تھا۔ اس نے وِکّی کو اشارہ بھی کر دیا کہ وہ نیرا کو جس طرح ہو سکے پھُسلائے۔ اس سلسلے میں بے دریغ پیسہ صرف کرنے کی بھی اُسے کھُلی چھوٹ تھی۔ اور اب وِکّی تھا اور نیرا۔ وِکّی نے دفتر جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سارا دن نیرا کو گھُما رہا تھا۔ صبح انڈیا گیٹ ہوتا تو شام کناٹ پلیس میں گزرتی۔ دوپہر سنیما میں کٹتی۔ دلّی کی کوئی جگہ نہ تھی جہاں وِکّی نیرا کو لے کر نہ گیا تھا۔ دونوں کبھی سکوٹر پر ہوتے کبھی ٹیکسی پر۔ وِکّی نیرا کو دو قدم بھی پیدل نہ چلنے دیتا۔ کبھی وہ قطب مینار کی پانچویں منزل پر ہوتے اور کبھی بدھ جینتی پارک میں۔ کبھی جمنا کا کنارا ہوتا اور کبھی لال قلعہ کے پُرلطف مناظر۔ اگر کچھ کھانے کو طبیعت چاہتی تو کناٹ پلیس کی پُرکیف فضا میں کسی اعلیٰ ریستوراں کے نرم نرم گدّوں پر جم جاتے۔ ایک پَل کے لئے نیرا وِکّی سے دور نہ رہتی اور نہ وِکّی ایک لمحہ کے لئے اُسے دور ہونے دیتا۔

منسارام نے ایک بار اپنی چھٹی بڑھائی، دو بار بڑھائی۔ لیکن نیرا کے لئے کوئی مناسب لڑکا شمشیر بہادر کو پسند نہ آیا۔ وہ عجیب مخمصے میں تھا اور اب تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر کون شہزادہ ہے جو شمشیر بہادر کے تصوّر میں ہے۔ ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا —— "آخر تم کس طرح کا لڑکا نیرا کے لئے چاہتے ہو؟"

"میں ایسا لڑکا چاہتا ہوں۔" شمشیر بہادر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا —— "جو نیرا کے ساتھ ایسا جچے جیسے تمھاری اس انگوٹھی میں دمکتا ہوا ہیرا۔"

"مگر ایسا لڑکا ملے گا کہاں؟"

"منسارام!" شمشیر بہادر نے حوصلہ بندھاتے ہوئے کہا۔ "تم فکر کس بات کی

کر رہے ہو؟ یہ تمھارا اپنا گھر ہے، جب تک دل چاہے ٹھہرو، جو مرضی ہو کھاؤ، لڑکا میں نیرا کے لئے جلد سے جلد ڈھونڈ کر دکھا دوں گا۔"

شمشیر بہادر وقت سے کھیل رہا تھا۔ وِکی اور نیرا کے تعلقات گہرے ہوتے جا رہے تھے اور یہ بات منسارام اور اس کی بیوی کی نظر میں آتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن نیرا نے اشارتاً اپنی پسند کا ذکر ماں سے کر دیا۔ ماں نے منسارام سے کہا۔ منسارام کو بھی وِکی میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اس نے بیوی سے کہا کہ وہ شمشیر بہادر کی بیوی سے وِکی اور نیرا کی شادی کی تجویز پیش کرے۔ شمشیر بہادر اور اُس کی بیوی تو اس لمحہ کی تاک میں ہی تھے۔ جیسے ہی نیرا کی ماں نے تجویز رکھی، شمشیر بہادر اور اُس کی بیوی نے اُسے یوں لپک لیا جیسے کھلاڑی گیند کو لپکتا ہے۔

وِکی اور نیرا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ منسارام نے دل کھول کر براتیوں کی خدمت کی اور اپنی بیٹی اور داماد کو وہ سب کچھ بھینٹ کر دیا جو وہ کویت سے لایا تھا۔ اس میں جہیز کے وہ وعدے بھی شامل تھے جو بعد میں پورے کئے جانے تھے۔ منسارام بے حد خوش تھا۔ یہی کیفیت شمشیر بہادر کی تھی۔ وِکی کا سیروں خون بڑھ گیا۔ شمشیر بہادر نے بھی اپنی توفیق سے بڑھ کر اس شادی پر صرف کیا۔ اپنی بہو کے لئے ایسے ایسے کپڑے اور زیورات بنولئے تھے کہ ان کا جواب نہ تھا۔ اُس نے ساری زندگی کا اثاثہ اس سودے میں لگا دیا تھا۔ کیونکہ اُس کے منصوبہ کے مطابق یہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے فائدہ مند سودا تھا۔ اُس نے اطمینان کر لیا تھا کہ منسارام جو جہیز دے گا اُس کی مالیت تیس ہزار سے کم نہیں ہے۔

لیکن آٹھ دن کے بعد جب منسارام کے جانے کا دن آیا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے ارادوں اور ارمانوں اور اُمیدوں کی ارتھی سجائی جا رہی ہے۔

منسارام کے ساتھ وِکی کا سامان بھی باندھا جا رہا تھا۔ وہ نوکری چھوڑ کر

کویت جا رہا تھا۔ جہاں اُسے اپنے سُسر کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونا تھا۔ عام حالات میں شمشیر بہادر بہت خوش ہوتا مگر موجودہ صورت میں وہ دُکھی تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو کھو رہا تھا۔ اُس کی تنخواہ کے تین سو روپے کھو رہا تھا، جو بیٹا ہر مہینے سعادت منڈی سے اپنے باپ کو لاکر دیتا تھا۔ اور سب سے بڑا سرمایہ وہ جہیز کھو رہا تھا جو وِکّی کی شادی میں مِلا تھا۔

"بیٹے تم یہ سامان کس لئے لے جا رہے ہو؟" اس نے وِکّی سے پوچھا۔ "تمہارے سُسر کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ کویت میں سب چیزیں ملتی ہیں۔"

مگر بیٹے نے باپ کے شاہ کو پیادے سے مار دیا۔ وہ وہاں جاکر اپنے سُسر کا دست نگر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا۔ "اِس جہیز کے سامان سے میں اپنی الگ گرہستی بساؤں گا۔ الگ کام کروں گا۔ میں اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اگلے دن شمشیر بہادر کا پورا گھر خالی ہو گیا۔ اُس کا دوست اور اس کی بیوی جا چکے تھے۔ اُس کا بیٹا اور بہو بھی جا چکے تھے۔ جہیز میں ملے ہوئے کپڑے، تحفے، زیورات اور آرائش کا سامان جا چکے تھے۔ اُس کی زندگی بھر کا وہ سرمایہ جا چکا تھا جسے اُس نے شادی میں اور بہو کے زیور کپڑوں پر صرف کر دیا تھا۔ بہو بیٹا وہ بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ایک غلط چال سے شمشیر بہادر اپنی زندگی کی سب سے بڑی جیتی ہوئی بازی ہار گیا تھا۔

بشریٰ انجم

اے مریم کے خدا

آمنہ باجی پورے دنوں سے تھیں۔ امی تو ہر وقت بس جائے نماز پر بیٹھیں رہتیں یا ہر وقت دست بہ دعا "یا اللہ خیر کیجو"۔ "بس یہ وقت خیریت سے گزار دیجیو۔ آمنہ بیٹی کو چاند سا بیٹا دیجیو تاکہ وہ سلمان کا غم بھول جائے۔ تو تو بڑا رحیم ہے۔ بڑا کریم ہے۔ بس ہم دکھیوں پہ رحم ہی کرنا...."

اور ادھر آمنہ باجی تھیں کہ ہر وقت خاموش، غمگین اور اداس۔ کسی طرح ان کا دل ہی نہیں بہلتا تھا۔ میں کالج سے واپس لوٹ کر فوراً ان کے کمرے میں جاتی۔ کالج کے اور سہیلیوں کے دلچسپ قصے باجی کو سناتی لیکن ان کے لب پر کبھی مسکراہٹ نہ کھیلی۔ سلمان بھائی کے المناک حادثے کے بعد ان پہ ایک سکتہ سا چھا گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ان کے پیٹ میں بوجھ نہیں تھا بلکہ ان کے دل پہ بوجھ تھا —— ایسا بوجھ جس سے انھیں سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔

ایک رات گہری نیند میں مجھے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی، مجھے اپنے ساتھ والے کمرے سے باجی کے چیخنے اور امی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں بھاگ کر باجی کے کمرے کی طرف گئی۔ امی فوراً پکار دیں: "درانہ بیٹی تم باہر ہی رہو۔ دعا کرو کہ سب خیریت ہو۔"

میں باہر بڑے کرب و اضطراب کے عالم میں ٹہل رہی تھی اور آمنہ باجی کی چیخیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اور میں اپنی مٹھیوں کو اتنا ہی بھینچتی چلی جا رہی تھی۔ اتنے میں بچے کے رونے کی آواز آئی اور میری پلکوں سے آنسوؤں کے بند ٹوٹ گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد امی نے کواڑ کھولا۔

"درانہ بھانجا مبارک ہو، آجاؤ۔" میں جنگلی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی آمنہ باجی کی طرف لپکی اور ان کے نم ہوئے منہ اور بھیگی ہوئی آنکھوں کو دیوانہ وار چومتے ہوئے پکاری۔ "باجی مبارک ہو۔ باجی دیکھا وہ کتنا بڑا کارساز ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے ان کے پہلو میں لیٹے ہوئے چاند کو دیکھا، اُف کتنا پیارا۔ کتنا معصوم اور کتنا خوب صورت۔ بالکل سلمان بھائی۔ میری آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔

امی نے مجھے آمنہ باجی سے جدا کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا۔ جی ہولا نہ کر۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

"پر امی آمنہ باجی باتیں کیوں نہیں کرتی؟ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ اس طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے میری طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟ یہ بولتی کیوں نہیں؟ اس نے رونا کیوں بند کر دیا ہے؟ امی ڈاکٹر کو بلاؤ، امی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ باجی کو کچھ ہو گیا ہے

"گھبراؤ نہیں درانہ۔ یہ تو کافی دیر سے ایسے ہی پتھر بنی ہوئی ہے، تم جاؤ کچھ دیر اپنے کمرے میں آرام کر لو۔ میں آمنہ کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ پھر کچھ وقت کے بعد تم آمنہ کے پاس آجانا۔ جاؤ میری بیٹی۔" امی مجھے کاندھوں سے پکڑ کر دروازے تک لے آئیں۔

اپنے کمرے میں بیٹھ کر میں کافی دیر تک آمنہ باجی کے متعلق سوچتی رہی۔ کسی کروٹ چین نہ آ رہا تھا۔ اک عجیب سی اُلجھن تھی دماغ میں جیسے چکیاں چل رہی تھیں۔ غنودگی کے عالم میں تھی کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔

"درانہ اُٹھو، جلدی کرو، آمنہ تجھے بلا رہی ہے، اس کی حالت غیر ہو گئی ہے۔" سامنے امی گھبرائی ہوئی کھڑی تھیں۔

میں ننگے پاؤں ننگے سر آمنہ باجی کی طرف بھاگی۔ پیچھے پیچھے امی تھیں۔

"باجی کیا بات ہے؟ دل میلا نہ کرو، زندگی سے اتنی بیزار نہ ہو، سلمان بھائی کو ہی تم نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ کیا ہم تیرے کچھ بھی نہیں؟ امی کے ہاتھوں کی طرف دیکھو ان ہی ہاتھوں نے تمھیں لوریاں دی ہیں، ان آنکھوں کی طرف دیکھو جنھوں نے تمہارے لئے رَت جگے کئے ہیں۔ اس آغوش کی طرف دیکھو آمنہ جس نے اس زندگی کے تپتے ہوئے ریگستان کی لُو تک تمھیں نہیں لگنے دی ہے۔ میری طرف دیکھو آمنہ۔ میں بچپن میں بھی تم سے مار کھاتی رہی، لڑکپن میں بھی تم مجھے بُرا بھلا کہتی رہیں۔ جوانی کے صحرا میں تم نخلستانوں کی تلاش کرتی رہیں اور ایک سراب سے دوسرے سراب کی طرف مجھے بھی اپنے ساتھ ہم سفر رکھا اور آج ہمیں ان تمام وفاؤں کا صلہ تم یہ دے رہی ہو، آمنہ لوٹ آؤ، لوٹ آؤ ہماری طرف، ہماری محبت ہماری ہمت آج بھی تمہیں سہارا دے سکتی ہے، سلمان بھائی تو بے وفا تھے، بے وفا تھے، میری گجو کا ساتھ چھوڑ گئے، میری گجو سے روٹھ گئے۔ بے وفا۔ بے وفا۔" اور میں بلک بلک کر رو رہی تھی، ساتھ ہی منّے نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

آمنہ باجی نے اپنے دونوں سرد ہاتھوں سے میرا منہ اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔

"درانہ قسم دو، اسے اپنا سمجھو گی۔ اس کی ماں کا نام درانہ ہے، یہ رونا نہ رہے گا۔ قسم دو درانہ، ق... س... م..." اور ان کا چہرہ خود بخود کعبہ کی طرف ڈھلک گیا اور باجی کے پہلو سے روتے ہوئے ننھے کو اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بوجھل قدموں سے لوٹ آئی۔ جذبات اور احساسات سب کچھ گم ہو گئے تھے، میرے آنسو منجمد ہو چکے تھے۔

دوسرے دن صبح پھر آمنہ باجی کو نہلا دھلا کر دلہن بنا کر سلمان بھائی کے پہلو میں چھوڑ آئے۔

منّا سارا دن بلکتا رہا، روتا رہا، میں نے بازاری دودھ کئی بار اسے پلانے کی کوشش کی لیکن وہ روئے جا رہا تھا، امی نے کئی مرتبہ منّے کو لینا چاہا لیکن میں نے انھیں ایک بار بھی منّے کو چھونے نہ دیا۔

دوسری رات ڈھل رہی تھی۔ منّا رو رو کر ہلکان ہو چکا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھی دم توڑ رہا ہو۔ میں نے بھی اندھیرے میں ہی سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

میرا گلا رُندھ چکا تھا، میری چھاتی میں درد ہو رہا تھا، میرے سینے کے اندر اک ہلچل سی مچی تھی اور میں زیرِ لب کہہ رہی تھی:۔ تو اتنا ظالم تو نہیں ہے؟ ایک ہی گھر کی طرف تیری نظر کیوں ہو گئی ہے؟ میں بھی تو عورت ہی ہوں، کنواری ہوں تو کیا ہوا، ماں تو بن سکتی ہوں ——— ' اے مریم کے خدا' تو اگر حضرت مریم کے ہاں حضرت عیسیٰ کو بغیر کسی مرد کے پیدا کر سکتا ہے تو کیا ایک کنواری کی چھاتیوں میں دودھ نہیں بھر سکتا؟ بول اے مریم کے خدا بول۔ میرا یہ بچہ کبھی کیا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا؟ کیا عمر بھر ندامت کی زندگی بسر کرتی رہوں گی کہ بہن کے ساتھ کیا ہوا عہد بھی پورا نہ کر سکی؟ میری چھاتی میں اور بھی زیادہ درد شروع ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سینے کے اندر کوئی چیز ٹھاٹھیں مار رہی ہو۔ میں نے دیوانگی اور وارفتگی کے عالم میں اپنی قمیض اٹھا کر روتے ہوئے منّے کو اپنی ننگی چھاتیوں کے ساتھ لگا کر بھینچا اور پھر مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری چھاتیاں پھٹ جائیں گی، میں نے اپنی ایک چھاتی منّے کے مُنہ میں دے دی۔ تھوڑی دیر تو وہ روتا رہا ——— اور پھر اس نے چسکیاں لینی شروع کر دیں ——— منّا غٹا غٹ دودھ پی رہا تھا ——— اک طوفان کے بعد اک خاموشی تھی ——— منّا میرے پہلو میں لیٹا میٹھی نیند سو رہا تھا اور میں اپنی سسکیوں کے درمیان اپنی انگلیاں اپنے دانتوں میں دبائے آہستگی سے کہتی جا رہی تھی :۔

"اے مریم کے خدا ——— اے مریم کے خدا ——— اے مریم کے خدا"

ہماری مطبوعات

بچوں کا ادب

جن پر حکومت ہند نے مصنفین کو انعامات دیے

بجو می آپا — اطہر پرویز — ۱٫۷۵

مصنوعی چاند — " — ۱٫۵۰

خلا کا سفر — " — ۱٫۲۵

توانائی کا راز — " — ۱٫۲۵

ستاروں کی دنیا — " — ۲٫۰۰

بھارت دیش ہمارا دیس — جاوید اقبال — ۱٫۰۰

ہماری یاد دنیا — فصاحت حسین — ۱٫۰۰

چند اور

بدن کی کہانی (معلومات)

اطہر پرویز ۱٫۲۵

تیس مار خاں (بچوں کا ناول)

شاہد علی خاں ۱٫۷۵

اکبر و بیربل کے لطیفے ۰٫۴۰

سائنس کی دنیا " ۲٫۶۴

پتھروں کا مغنی (مجموعہ کلام)

قیمت: ۶/-

وحید اختر

"وحید اختر کے کلام میں گہرائی، بلاغت اور معنویت ہے۔ فن کے نئے امکانات پر ان کی نظر ہے مگر انھوں نے عالمی کلاسیکی ادب سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ انھیں خوبیوں سے یہ مجموعہ ہماری شاعری میں قابل قدر اضافہ ہے" (پروفیسر آل احمد سرور)

"وحید اختر اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو شاعری کی موروثی آبرو کا بھرپور لحاظ رکھتے ہوئے نئی زندگی کی تخلیقی عکاسی کرتے ہیں۔ میں نے ان کے مجموعے کو پہلے سے آخری صفحہ تک تامل کے ساتھ پڑھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وحید اختر "پتھروں کا مغنی" سے لے کر "صحرا سکوت" تک یکساں طور پر کامیاب ہیں۔"

(پروفیسر مجنوں گورکھپوری)

چند ادبی کتابیں

ادب اور زندگی (تنقید) پروفیسر مجنوں گورکھپوری ۵/-

ادب کا مطالعہ (تنقید)

اطہر پرویز ۵/-

رقص بسمل (افسانے)

صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲/۷۵

دودھ اور خون (افسانے)

صدیقہ بیگم ۲/۵۰

ہولی اور چراغ (ڈرامے)

اطہر پرویز ۲/۶۲

شرابی (ڈرامے)

اطہر پرویز ۰/۶۵

کتابیں

ہماری سائنس

وزارت حسن ۲٫۰۰

سائنس کے کرشمے

وزارت حسن ۲٫۰۰

اردو گھر ○ یونیورسٹی مارکٹ ○ علی گڑھ

جوشؔ ملیح آبادی

نظم

بُلبُل با احتیاط چہک شاخسار سے
اُڑتی ہے گُل کی نیند نسیمِ بہار سے
گو بوستان نژاد ہے تو، پھر بھی آج تک
واقف نہیں ہے نازکیٔ برگ و بار سے
تیری نوا میں آنچ ہے تیری فغاں میں آگ
اُٹھنے لگے دھواں نہ کہیں مُرغزار سے
کیوں کر تجھے بتا دُوں کہ پھولوں کے رنگ میں
پڑتی ہے اوس موجِ صبا کے غبار سے
نرگس کراہتی ہے تڑپتی ہے یاسمن
ننھی سی اک شعاع کے بوس و کنار سے
تجھ کو خبر نہیں کہ لرزتی ہیں پتّیاں
صرف ایک نیم قطرۂ شبنم کے بار سے
نرمی سے نغمہ زن ہو ارے عندلیبِ زار
کٹ جائے پنکھڑی نہ ترانوں کی دھار سے
شیشوں سے کھیلتے ہیں کس آہستگی کے ساتھ
یہ نکتہ سیکھ جوشِؔ لطافت شعار سے

احمد ندیم قاسمی

کمالِ دانش

سُنا ہے
ایک ایک ذرّے کے گرد
ایسا ایسا نظامِ گردش رواں دواں ہے
کہ ذہن اُس کے رموز پر غور کرتے کرتے
خود ایک گردش میں مبتلا ہے
فضا کا ایک ایک ذرّہ اک آفتاب ہے
اور کتنے مریخ و مشتری
اَن گنت زمینیں
ہزاروں چاند
اس کے گرد محوِ طواف ہیں
میں زمین پر اک مہین نقطے کی حیثیت میں یہ سوچتا ہوں
کہ اُن زمینوں پہ ——
ایک ذرّے کے گرد جو اُڑتی پھر رہی ہیں ——
کوئی تو مخلوق بستی ہوگی
وہاں بھی صبحوں کے اور شاموں کے رُوپ میں
زندگی مسرّت کے اور اُداسی کے مرحلوں سے گزرتی ہوگی
یہ عصرِ حاضر کی دانشِ بے پناہ ہے
جس نے میری دُنیا کو
ایک کُرے سے ایک ذرّہ بنا دیا ہے

مخدوم محی الدّین

اپنا شہر

یہ شہر اپنا، عجب شہر ہے
کہ راتوں میں
سڑک پہ چلیے تو سرگوشیاں سی کرتا ہے
بُلا کے زخم دکھاتا ہے
رازِ دِل کی طرح

دریچے بند
گلی چُپ
نڈھال دیواریں
کواڑ مُہر بلب
گھروں میں میّتیں ٹھہری ہوئی ہیں برسوں سے
کرایہ پر

حسن نعیم

اک درخت، اک تاریخ

کس قدر سنجیدہ، کتنا باوقار
راہ سے لگ کر کھڑا ہے
ایک انجانے قبیلے کا درخت

گرمیوں میں،
گنگناتا ہے ہوا کے ساز پر
سردیوں میں مسکراتا ہے
لباسِ برف زیبِ تن کیے
کس قدر موسم زدہ ہیں اس کے پتے!
کس قدر موسم شکن اس کا مزاج!

کیا پتہ کس مُلک سے آئے تھے
اس کے آب و جد
کس نے شاخوں کو سنوارا ؟
کس نے خونِ دل دیا ؟
جانے کن متروک حرفوں میں
تنے کے آس پاس
کوئی بھولی داستاں مرقوم ہے

ایک دن سائے میں اس کے میں جو ٹھہرا دو گھڑی
جیسے جھک کر اس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا :
"وہ دیارِ غرب ہو کہ گلستانِ شرق ہو،
ظلم کے موسم میں بوئے گل سے کھلتے ہیں گلاب
جستجو کی منزلوں میں خواب کی مشعل لیے
ڈالیوں پہ آ کے گرتے ہیں تھکے ماندے پرند
آشیاں بندی میں رنگ و نسل کی تمیز کیا ؟
تفرقہ کیا !
جابر و مجبور کی دنیا الگ، عقبیٰ الگ
ایک سی ہیں گو صلیبیں
مختلف پیغام ہیں، انجام ہیں
مختلف خوئے صنم، طرزِ سجود،
میرے سینے بن چکے نادار کے لوح و کتاب
اب بھی ہے نوکِ قلم ہیں میری شاخوں کا لہو
پتے پتے میں ابھی تک باغیوں سا جوش ہے
ہم نے تو ٹھنڈے کیے ہیں کتنے طوفاں،
تم کہو
آدمی میں سرفرازی کا جنوں باقی ہے کیا ؟

شاذ تمکنت

سایہ

کون ہو تم! یہاں کس لئے آئی ہو

سرد کمرہ، اُداسی، گھنی خاموشی
آنکھیں دُھندلے دریچوں کی روئی ہوئی
روشنی مضمحل، زرد رُو، جاں بہ لب
نیم تاریک بستر پہ سوئی ہوئی
میز پہ کاغذی پھول ہنستے ہوئے
طاق پر مرمری بُت کی تنہائیاں
فرش پر رنگتیں کسمساتی ہوئی
ایک نادیدہ پیکر کی پرچھائیاں

سبز چوبی پرندے اڑانوں میں گم
زندگی کی حقیقت فسانوں میں گم

اس کیلنڈر پہ تاریخ مصلوب ہے
دن کہ گردن میں پھانسی کا پھندہ لئے
لمحہ لمحہ کی آنکھوں سے مجبوب ہے
رُک گیا آسماں، تھم گئی ہے زمیں
خانہ ویرانیٔ آرزو، اور میں
ان میں اب ایک شے بھی تو زندہ نہیں

کون ہو تم! یہاں کس لئے آئی ہو

عمیق حنفی

کھیتی

وقت کی کھیتی ہیں ہم
وقت بوتا ہے، اُگاتا، پالتا ہے
اور بڑھنے کے مواقع بھی ہمیں دیتا ہے وقت
سبز کوزیں بنانے کی اجازت مرحمت کرتا ہے اور
ناچنے دیتا ہے بادِ شوخ کی موجوں کے ساتھ
جھومنے دیتا ہے سورج کی کرن کی ہمدمی میں
چاندنی پی کر ہمیں بدمست پاتا ہے تو خوش ہوتا ہے وقت
پھولنے پھلنے کی تدبیریں بتاتا ہے ہمیں
ہاں ــــ مگر انجامِ کار
کاٹ لیتا ہے ہمیں
ہم بالآخر اس کے نغمے
ہم بالآخر اس کی فصل!

محمد علوی

پہلا خدا

اندھیرا تھا!
چاروں طرف
موت منڈلا رہی تھی!
نگاہوں میں
مایوسیاں بس گئی تھیں!
دلوں میں
کئی خوف گھر کر گئے تھے!
تو اس وقت
ہم نے
نہایت عقیدت سے
پہلے خدا کو پکارا
وہ پہلا خدا
جس نے ہم کو
اندھیروں سے باہر نکالا
اجالوں کی نعمت عطا کی
مگر ہم اسے بھول بیٹھے!
کہاں ہے
وہ پہلا خدا اب کہاں ہے؟
ہمیں پھر
ضرورت ہے پہلے خدا کی!!

حرمت الاکرام

کلکتہ : اِک رُباب

اک خوش گوار کرب میں کھویا ہوا یہ شہر
جاگا ہوا کبھی، کبھی سویا ہوا یہ شہر
قاتل لطافتوں میں ڈبویا ہوا یہ شہر
ہنگاموں کی لڑی میں پرویا ہوا یہ شہر
یہ شہر۔ ایک آئینہ خانہ حیات کا
کہتا ہے روز تازہ فسانہ حیات کا
آلائشوں کی گود میں تہذیب کا نمو
جیبیں تہی نصیب، جراثیم کو بہ کو
انساں کے رُخ پہ زردیاں، پیمانے سُرخرو
کس طرح چاکِ سینۂ احساس ہو رفو
ہوٹل[1] نہ ہو تو بھوک کا چارہ نہ ہو سکے
فٹ پاتھ[2] کے بغیر گذارہ نہ ہو سکے

سرمایہ بن کے اٹھا مسیحائے احتیاج
بازاروں اور دکانوں میں پہنچی گھروں کی لاج
حوّا کی بیٹیوں کو پنھا کر وفا کا تاج
افسونِ زرگری کا لیا وقت سے خراج
تقدیس کے حصار کو مضبوط کر دیا
کوٹھوں[3] کو ریستورانوں[4] سے مربوط کر دیا
یہ لیڈروں کا شہر یہ نعروں کی رزم گاہ
جگہ میں سازشوں کے سیاست کے دادخواہ
یہ ملک کے امیں یہ وزارت کے بادشاہ
کاروں میں اینڈتے ہوئے یارانِ کج کلاہ
جلسوں کا شور وغل ہے جلوسوں کا زور ہے
اہلِ ریا کے دل میں الیکشن کا چور ہے

۱؎ کلکتہ کی بیشتر آبادی کا گذارہ ہوٹلوں پر ہے ۲؎ کلکتہ کی رات کا تصور فٹ پاتھوں کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ ان کا وجود ان گنت انسانوں کے لئے خواب گاہ و استراحت کا نعم البدل ہے ۳؎ جسم فروش عورتوں کے بالا خانے ۴؎ اُن ریستورانوں اور چائے خانوں کی جانب اشارہ ہے جہاں "سروس" کا کام خواتین کے سپرد ہے۔

ہوڑہ برج کی قامتِ بالا کا بانکپن
جیسے کوئی بزرگ رشی جاپ میں مگن
سکتے میں جیسے دفعتاً آ جائے اہرمن
یا ناگ دیو خود کو سمیٹے، اٹھائے پھن

فولاد کا یہ معجزہ حکمت کی سان پر
ارجن ہو جیسے تیر چڑھائے کمان پر

دمدم — یہ ارتقا کی اڑانوں کی جلوہ گاہ
انساں پہ کھولتا ہوا اوجِ فلک کی راہ
میدان کی فضائیں سکونِ دل و نگاہ
چپ چاپ سا منارہ، یہ تاریخ کا گواہ

برپا یہ حشر، ریس کی بزمِ نبرد میں
عقل آدمی کی اڑتی ہے ٹاپوں کی گرد میں

ماضی کے خشک سینے سے اٹھنے لگے بھنور
کس کس طرح لرزتا ہے تاریخ کا جگر!
افسانہ بلیک ہول کا نہوڑائے اپنا سر
عیاریٔ فرنگ کی دیتا ہوا خبر

ملتا ہے شرمساریِ پنہاں لیے ہوئے
خود اپنے ہی اندھیروں کا طوفاں لیے ہوئے

کلکتہ — ارضِ مغربی بنگال کا سنگار
اونچی اٹاریوں کی تب و تاب کا دیار
کلبوں، سنیما ہاؤسوں، باروں کا حشر زار
اس شہر میں کہ ہند کے ماتھے کا ہے وقار

شام آتی ہے تو زندگی بیدار ہوتی ہے
رات اپنے گیسوؤں میں اجالے پروتی ہے

شام آتی ہے تو جاگ سی اٹھتی ہے ہر پھبن
جاگ اٹھتا ہے اندھیرے کی فطرت کا بانکپن
ہر زاویے سے سجتی ہے تہذیب کی دلھن
ملتا ہے مشک بار تمدن کا ہر ختن

کیا چیز ہے اندھیرے کی دولت نہ پوچھئے
اہلِ خطا سے رات کی قیمت نہ پوچھئے

رات آتی ہے کہ دخترِ انگور ہو جواں
لچکے نشاط خانوں میں نغمات کی کماں
ہنگامِ رقص، جسم کا ہر خط ہے جواں
آ جائیں کھنچ کے سڑکوں پہ کلبوں کی منڈیاں

غیرت برہنہ پا ہے اجالوں کے دشت میں
رخسار و زلف و لب کی دکانیں ہیں گشت میں

آتا ہے رات کو سوا نیزے پہ آفتاب
گوشے میں چھپ کے بیٹھتی ہے رسمِ احتساب
انگڑائی حسن لیتا ہے بل کھاتا ہے شباب
جاموں کی قیدِ ضبط میں رکتی نہیں شراب

ہوتا ہے انتظار کہانی شروع ہو
چھا جائے تیرگی تو قیامت طلوع ہو

ادا جعفری

میلادِ بہار

راز داں بہاروں کے
تم کہ طفلِ ناداں ہو
جانے کس گلستاں سے
میرے پاس آ پہنچے
کتنے شوق سے میں نے
اپنے گھر کے آنگن کی
تم کو آبرو بخشی

نازسب حسینوں کے
ایک جیسے ہوتے ہیں
(اپنے عکس کے آگے
سارے رنگ پھیکے ہیں)

سال بیت جائیں گے
جب بہار آئے گی
ریشمیں شگوفوں کے
زمزمے بکھیرو گے
اپنے آپ میں کھو کر
نکہتوں کے شہ پارے
لوحِ جاں پہ لکھو گے
سوچ ہرجائی کی

جب بہار آئے گی
جانے میں کہاں ہوں گی
پیچ و خم سے بنتی ہے
منزلوں کی پگڈنڈی
تم تو بھول جاؤ گے
لمس میرے ہاتھوں کا
خواب میری آنکھوں کے

میں تمہیں نہ بھولوں گی
میں کہ فطرتاً ماں ہوں

لیلیٰ عطاء اللہ

بے بسی

مجھ سے کہتی ہیں روایاتِ کہن
اور بتلاتے ہیں بزرگوں کے چلن

لڑکیاں پردوں میں مستور بھلی
مرد کی ذات ہے عنوانِ جلی

شعر کہنا نہیں اچھا ہوتا
دل کی دنیا کا بیاں ٹھیک نہیں
لڑکیاں راز نہ کھولیں اپنے
لڑکیاں خود کو چھپا کر رکھیں

میں نے کب شاعری کی ۔ جرم ہوا
مجھ کو تو اس کا تصور بھی محال
اتنی صدیوں کی چٹانوں کے تلے
کون کر سکتا ہے تخلیقِ جمال

جسم تو خیر چھپا رہتا ہے
ہو سکے گر تو اسے اور چھپاؤ
دل کو بھی قید رکھو
روح کے چہرے سے پردے نہ اٹھاؤ

اپنے پردے بھی اٹھاتا ہے کوئی
کون ہے خود کو جو عریاں کر دے
کون ہے بن کے جو اک موجِ صبا
نکہتِ گل کو پریشاں کر دے

کیوں کہوں، خالقِ اشعار ہوں میں
اپنی سوچوں میں گرفتار ہوں میں

اُپندر ناتھ اشک

کِس کی بات؟

کردار:-

سونیا	مردُلا
شنکر	بڑے پنڈت
دیانند	بڑی بہو

(پردہ اٹھتا ہے تو پادھیائے پنڈت ہردے نرائن مشر کے مکان کی نچلی منزل کے دو کمروں میں اٹھتا ہے۔ سامنے اسٹیج دو حصّوں میں منقسم نظر آتا ہے[1]۔)

بائیں جانب کا کمرہ پنڈت جی کے بیٹے پروفیسر دیانند کی اسٹڈی اور لائبریری ہے۔ اس کمرہ میں تماشائیوں کی طرف جالی کی شفّاف دیوار ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی دیوار کے ساتھ اس طرف کو دائیں جانب کی دیوار کے کونے میں ایک میز کرسی لگی ہے۔ میز پر پیپر ویٹ اور پیتل کا بہت خوب صورت کشمیری ٹیبل لیمپ رکھا ہے۔ بائیں دیوار سے

---

[1] جہاں ایسا سیٹ بنانے کی سہولت نہ ہو یا اسٹیج چھوٹا ہو وہاں درمیانی دیوار کے بغیر ایک ہی کمرے سے دونوں کام لیے جا سکتے ہیں۔ دیانند باہر کے دروازے سے لگا لوکر نوکرانی کی بات چیت سُن سکتا ہے۔ ایک بار جب اُن کی پُشت اس کی طرف ہوتی ہے تو وہ تماشائیوں کو نظر بھی آجاتا ہے اور تماشائی جان لیتے ہیں کہ وہ چھپا کھڑا ان کی باتیں سُن رہا ہے۔

بڑی آرام کرسی لگی ہے۔ اس کے پیچ دار ہتھے باہر نکال دیں تو میز کے ساتھ لگی ہوئی کرسی تک جا پہنچتے ہیں۔

بائیں اور سامنے کی دیوار کے کونے میں کتابوں کے ریک پڑے ہیں۔ اوپر دائیں بائیں دیواروں پر ٹیگور، تالستائے اور پریم چند کی تصویریں آویزاں ہیں۔ سامنے کے دروازے کے اوپر دیوار پر پروفیسر دیانند اور ان کی نئی نویلی بیوی مردلا کا خوب صورت فوٹو آویزاں ہے۔

آرام کرسی سے ذرا پرے بائیں دیوار میں ایک دروازہ ہے، جو باہر کو کھلتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ ہے، جو خواب گاہ میں کھلتا ہے۔ دائیں دیوار کے پرے کونے میں ایک دروازہ ہے جو کھانے کے کمرے میں کھلتا ہے۔

کھانے کا کمرہ اسٹیج کے دائیں حصے میں ہے۔ کھانے کی نئی چھوٹی میز اور چار کرسیاں اسی میں سجی ہیں۔ میز پر ایک گل دان ہے جس کے پھول قدرے مرجھا گئے ہیں۔ سامنے ایک سائیڈ بورڈ رکھا ہے، جس کے اوپر کے شیشے میں سے چینی کے پیالے پلیٹیں قرینے سے سجی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک خوب صورت گول کشتی میں بہت ہی خوب صورت شیشے کے گلاسوں کا سیٹ معہ جگ کے رکھا ہے۔ دو گلاس کشتی کے باہر پڑے ہیں اور جگ پانی سے نصف بھرا ہوا ہے۔

پردہ اٹھتا ہے تو دیانند آرام کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھتا نظر آتا ہے۔ چند لمحوں بعد وہ کتاب منہ پر رکھ کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہے اور ٹانگیں کرسی کے باہر کو نکلے ہوئے ہتھوں پر پھیلا لیتا ہے۔ اسی وقت کھانے کے کمرے میں شنکر اور اس کی بیوی سونیا دھلی پلیٹیں اور دوسرے چینی کے برتن اٹھائے اور بحث کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ دونوں جوان ہیں۔ برتن لا کر کھانے کی میز پر رکھ دیتے ہیں۔ ذیل کے مکالموں میں بحث کرتے ہوئے وہ دونوں پلیٹیں پونچھ کر سائیڈ بورڈ میں رکھتے، گل دان اٹھا کے پلاسٹک کا سیاپوش گیلے کپڑے سے صاف کرتے اور پھر اس پر شام کو چائے کے لئے پیالے، پلیٹیں

رکھ کر درمیان میں گل دان سجاتے ہیں۔ (دوپہر کا وقت ہے۔ گھڑی میں ڈھائی بجنے کو ہیں۔)

سونیا:۔ (شنکر کے آگے داخل ہوتی ہوئی، پیچھے کو مُنہ گھما کر) توہرا دماگ خراب ہے۔ ہم گریب منئی بڑن کے نکل کر سکت ہیں؟ (میز پر کھٹ سے برتن رکھتی ہے۔ اسٹڈی میں دیانند چونکتا ہے۔)

شنکر:۔ (میز کے دوسری طرف برتن رکھتے ہوئے اس احمق کو سمجھانے کے لئے بڑے ضبط سے) کیوں، نردھنوں کے ہردیہ نہیں ہوتے کیا؟

سونیا:۔ ہردا ہوتا ہے پر دماگ نہیں ہوتا۔ تیری کھوپڑی میں دماگ ہوتا تو ایسی سرم کی بات کرتا؟

شنکر:۔ دماغ نہیں مستشک اور شرم نہیں لجّا کہو۔ بڑے پنڈت نے کتنی بار کہا ہے کہ اب ہندی سارے دیش کی بھاشا ہو گئی ہے۔ اب شدھ ہندی ...

سونیا:۔ ارے چلو، آپن گھر کی بھاسا تو آوت نہیں، دیس کی بھاسا کے پیچھے لٹھ لیے گھومت ہیں۔ میم صاحب کو دیکھو، سرم کا سرمے کہت ہیں۔

(اسٹڈی میں دیانند ٹانگیں نیچی کر کے بیٹھ جاتا ہے۔)

شنکر:۔ تو بات بات میں بہو کا انوکرن[1] کرے گی اور میں کہیں چھوٹے پنڈت کے انوکرن میں ...

سونیا:۔ چھوٹے پنڈت نہیں، صاحب کہو، انھیں پنڈت ونڈت کہانا پسند ناہیں اور بہو سہو کا لگائے ہو، میم صاحب کہا کر۔ میم صاب۔ ایم۔ اے پاس ہیں ایم اے۔

شنکر:۔ ایم۔ اے ہوں چاہے وِشارد، ہم تو بہو ہی کہیں گے۔ اسی گھر میں پالن پوشن ہوا، بڑے ہوئے، یہیں کی ریت نہ جانیں گے؟ ایک بار بھی نہیں ہوا چھوٹے

---

[1] انوکرن۔ پیروی کرنا، نقل کرنا۔

پنڈت کا بیاہ ہوئے اور اس گھر کی ریت بدل جائے گی۔ (ہاتھ مٹکاتے ہوئے) بیاہ کے بعد گھرن کی ریت بدل جات ہے۔ میم صاحب ماس مچھی کھات ہیں اور بڑے پنڈت اُنکر نا ہوُ

سونیا:۔ ناہیں لیتیں۔ صاب سول لین میں جگہا دیکھ رہے ہیں۔ الگ گھر بسئی ہیں۔ ہم تو میم صاب کے ساتھ جاب۔ بڑی اچھی ہیں۔ اِی ساڑی بلوچ تو دیئے ہی رہیں، اب دیکھو جوڑا باندھے بھی سکھائن ہیں اور رپین بھی دیہن ہیں۔ ایہاں محلّے میں ہے کولنوں کے اسین جوڑا؟

شنکر:۔ تو میم صاحب کے اوکرن میں جوڑا باندھے، پوڈر سُرخی لگائے اور میں یدی چھوٹے پنڈت کے پرکار سے کنجت[1]...

(سونیا کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے)

سونیا:۔ ارے... رے... رے۔ الگ ہٹ! سرم کیا گھول کے پی گوا ہے کا؟

(دیانند جھل کر اُٹھتا ہے اور دبے پاؤں جا کر پردے کی اوٹ میں کھڑا ہو جاتا ہے)

شنکر:۔ کیوں تمہارے صاحب کیا یہ سب...

سونیا:۔ دیکھت ہیں، جب سے صاب کی سادی بھئی ہے، تو ردماگ چل گوا ہے۔ دبیں کال کا کونوں گیان نہیں رہا۔ ہیاں کھانے کے کمرہ ماں تمہیں پیار اُمڈت ہے۔ بڑے پنڈت کا...

شنکر:۔ صبح چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک تو ہیں کاریہ میں وت[2] رہتے ہیں۔ پریم کیا ولایت میں امڈیے گا۔ اب ڈھائی بجنے کو آئے ہیں اور تمہارے صاحب کا مدھیانہ بھوجن سماپت ہوا ہے۔ وے تو اپنے کلش[3] میں کہیں وشرام کر رہے ہوں گے اور ہم کھانا کبھی نہیں کھا پائیں گے کہ

---

[1] چھوٹے پنڈت کی طرح [2] کام میں مصروف رہتے ہیں [3] دوپہر کا کھانا [4] کمرہ

چائے کا سمے ہو جائے گا۔

سونیا:- اب نئی نئی سادی، پھر اتوار آٹھ نو سے پہلے تو صاب اُٹھتیں ناہیں۔ جب دس بجے ناستہ کرہیں تب لنچ تو دوئی بجے ہوئے کری۔

شنکر:- (اس کی نقل اُتارتے ہوئے)، لنچ تو دوئی بجے ہوئے کری۔ ہماری بھی تو نئی شادی ہوئی ہے۔

سونیا:- تو تمہوں آٹھ بجے اُٹھا کرو۔

شنکر:- تمہوں آٹھ بجے اُٹھا کرو ـــ اور بڑے پنڈت اور بڑی بہو جو چار ہی بجے اُٹھ جاتے ہیں؟ چھ بجے اُنھیں جل پان چاہئے۔ اُوپر! سات بجے تمہارے صاحب کو چائے چاہئے۔ شَیْن گکش ہیں! نو دس بجے ناشتہ چاہئے یہاں! بارہ بجے بڑے پنڈت کھانا کھاتے ہیں ـــ اوپر ڈیڑھ دو بجے تمہارے صاحب میم لنچ لیتے ہیں، یہاں! ایک پل کی بھی فرصت ہمیں نہیں ملتی ـــ دوڑتے دوڑتے پاؤں دکھنے لگتے ہیں اور تو ایسی جلدی ہے کہ جو ابھی....

(اس کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے)

سونیا:- (اس کے ہاتھ کو جھٹکتی اور اُچھل کر اس کی پہنچ سے پرے ہوتی ہوئی) ارے الگ ہٹو۔ کا ہوئے گوا ہے تم کا۔ کل صاب اوپر سے آئے گئے۔ میں شرم سے پانی پانی ہوئے گئی۔

شنکر:- پھر تو نے ودیشی بھاشا بولی۔ کتنی بار بڑے پنڈت نے کہا ہے کہ گھر میں سب شدھ ہندی بولیں۔

سونیا:- ہم تو جب سے پیدا بھئے ایہی بھاسا بولت آئے ہیں اور ایہی بولبے۔

شنکر:- جو بولی آتی ہے اسے وسمرن[2] کر۔ تب تو یہاں سیو[1] کا نہیں تھی۔ اب تو تو

---

[1] سونے کا کمرہ [2] بھول جا۔

شدھ بھاشا بولا کر۔

سونیا:۔ بھلا تمہار شدھ بھاسا میں سرم سے پانی پانی ہونے کو کا کہیں گے؟

شنکر:۔ بول میں لجّا سے جل جل ہوگئی۔

سونیا:۔ (ہنستی ہے) ای تمہری شدھ بھاسا تمہیں کا مبارک ہوئے۔ تمہیں لجّا سے جلو۔

(دیا نند خاموشی سے ہنستا ہے اور کمرے کا چکّر لگا کر پھر دروازے کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے)

شنکر:۔ لجّا سے جلنا نہیں۔ جل جل ہونا۔ مطلب پانی پانی ہونا۔

سونیا:۔ مطلب وہی ہے تو پھر وہی کہے میں کا دوس ہے؟

شنکر:۔ وہ پرائی بھاشا ہے، یہ اپنی بھاشا ہے، ہماری بھاشا ہے۔ باہر سے نہیں آئی۔

سونیا:۔ ای کہاں باہر سے آئی؟ ہمار دادی پردادی یہی بولت رہیں۔

شنکر:۔ اب تجھے کون سمجھائے۔ تو ناری کی جات، تیری مت چوٹی کے پیچھے۔ بس کہہ دیا کہ شدھ بھاشا بول! نہیں آتی تو سیکھو۔ ہم بھی تو سیکھے ہیں۔ کہہ سرم سے.... نہیں .... لجّا سے جل جل ہوگئی۔

سونیا:۔ واہ! بڑے اکل والے، پنڈت گیانی!! اپنے نہیں والے اور اماں چلی بھنجانے!!! (منہ بگاڑ کر) بڑے پنڈت کی نکل میں شدھ بھاسا بولے گا، چھوٹے پنڈت کی نکل میں مہارُدو کو کھانے کے کمرے میں چھیڑے گا۔ اپنی اوکات میں رہ!

شنکر:۔ بڑے پنڈت چھوٹے پنڈت کی بات چھوڑ۔ ہم کہتے ہیں شدھ بھاشا بولی تو تجھے بولنی ہوگی۔ بول۔ میں لجّا سے جل جل ہوگئی۔

سونیا:۔ نہیں بولتی !

شنکر:۔ نہیں بولتی ؟

سونیا:۔ نہیں بولتی !

شنکر:۔ تو میری پتنی اور میری اتنی بات نہیں مانتی۔ ٹال تو جائیں بڑی بہو اٹھوا چھوٹی بہو بڑے پنڈت اٹھوا چھوٹے پنڈت کی بات !

سونیا:۔ بڑے چھوٹے پنڈت اپنی بہوؤں سے ایسی بیکوپھی کی بات کرت ہوئیں۔

شنکر:۔ تو تو نہیں مانے گی میری بات ؟

سونیا:۔ مانے لائیک بات ہوئی تو سَو بار مانب۔ دن میں دس اُلٹی سیدھی بات کہو تو کا ہے مانی۔ پڑے پنڈت چار اچھّر کا پڑھائے دہین کہ تیں اپنے کا بڑا گیانی سمجھے لگا۔ میں تو رسب گیان جانت ہوں۔ کوّا چلے ہنس کی چال . . . ! اپنی بھا سا بولی اپنی ریت سے رہ !

(کام ختم کرکے اور گل دان پھر میز پہ رکھ کر سائڈ بورڈ کھولتی ہے اور اس میں سے چائے دانی نکالتی ہے۔)

شنکر:۔ اچھا دیکھو، میں تجھ سے پھر کبھی انورودھ[2] نہ کروں گا۔ پہ اب کی میری بات رکھ لے۔ کہہ دے ایک بار۔ میں لجّا سے جل جل . . . .

سونیا:۔ تو ہار دماگ چل گوا ہے کا ؟

شنکر:۔ میری خاطر !

(سونیا جواب نہیں دیتی، سامنے دیوار پر ٹنگی کشتی اُتار کر چائے دانی اس میں رکھ دیتی ہے)

شنکر:۔ تو میری تنک سی بات نہیں مانتی، یدی[3] میں کوئی بڑی بات کہہ دوں تو کیا مانے

---

[1] یا [2] اصرار [3] اگر

گی۔ دیکھو پچھتائے گی بعد میں۔

سونیا:۔ تہوں پچھتو لو!

شنکر:۔ اچھا میں پرارتھنا کرتا ہوں۔ ایک بار کہہ دے۔ میں لجا سے جل جل ہوگئی۔

سونیا:۔ اُو جھاڑن اُٹھاؤ اور چلو۔

شنکر:۔ دیکھو میں ونمرلہ پرارتھنا کرتا ہوں۔ ایک بار میری بات رکھ لے، کہہ دے۔
میں لجا سے جل جل۔۔۔

سونیا:۔ تو پاگل ہوئے گئے ہو۔ چلو، دوئی کورلے کھائے لیو۔ ابہن سارے برتن
ٹے کا پڑے ہیں اور۔۔۔

شنکر:۔ تو ابھی سے میری بات موڑتی ہے۔ کل کو تو مجھے اپنی اُنگلیوں پر نرتیہ
کرائے گی۔ دیکھو میں کہتا ہوں۔ اچھا نہ ہوگا۔

سونیا:۔ اور موہنوں کہت ہوں کہ ہم سے ایسی اول جلول بات مت کیا کرو نہیں اچھا
نہ ہوئی۔ نرت کرائے گی ورائے گی — ای سب ہم کا ناہیں پسند ہے۔
(جانا چاہتی ہے)

شنکر:۔ (اسے روک کر) ایک بار کہہ دے، میں لجا سے جل جل ہو گئی۔

سونیا:۔ چھوڑ، چائے دانی لوٹ جائے۔۔۔ چھوڑ۔۔۔ چھوڑ۔۔۔
(چلی جاتی ہے)

شنکر:۔ (دانت پیستا ہوا) میں بھی اپنے پتا کا پُتر نہیں جو تم سے کہلا کر نہ چھوڑا۔
(جھاڑن اُٹھا کر غصہ سے کندھے پر پھینکتا ہوا نکل جاتا ہے۔ دیانند، جو
بڑی دیر سے ہنسی روکے ہوئے تھا، کھانے کے کمرے میں آکر زور سے
قہقہہ لگاتا ہے)

لہ عاجزی سے ٹہ نوالہ سے نچائے گی۔

مِردلا:۔ اپنے کمرے سے اسٹڈی میں داخل ہوتی ہے۔ کھانے کے کمرے کے دروازے میں آکر پردہ اُٹھاتی ہوئی) کیا ہوا جو اکیلے ہنسے جا رہے ہو؟

دیانند:۔ آؤ، آؤ، اِدھر آؤ۔

مِردلا:۔ (قریب جاکر) جی!

دیانند:۔ (ہنستے ہوئے) میں اُدھر آرام کرسی پر لیٹا تھا کہ سُنا میاں شنکر سونیا کو شدھ ہندی پڑھا رہے ہیں۔ یہاں دروازے میں کھڑا اُن کی باتیں سُننے لگا۔ بڑی دیر سے ہنسی روکے ہوئے تھا، اُن کے جاتے ہی پھوٹ پڑی۔

مِردلا:۔ شنکر سونیا کو شدھ ہندی پڑھا رہا تھا؟

دیانند:۔ ہاں ہاں! بات یہ ہے کہ شدھ ہندی کے بارے میں اِدھر پتاجی اور کبھی کٹر ہو اُٹھے ہیں۔ ہندی ہوگئی اب راشٹر بھاشا۔ ان کی نیتا گیری ختم سوا سے بنائے رکھنے کو وہ شدھ ہندی کا نعرہ بلند کئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ راشٹر بھاشا سے ہر ایک بدیسی لفظ نکال دینا چاہیے۔ اُردو اور انگریزی کا ایک لفظ بھی اس میں نہ رہنا چاہیے (جاکر کھانے کی میز کے کونے پر بیٹھ جاتا ہے)

مِردلا:۔ لیکن اس سے کیا راشٹر بھاشا کی ترقی ہوگی؟ انگریزی زبان آج جو ساری دُنیا کی زبان ہے اور روسی اور چینی تک اُسے سیکھنے کو مجبور ہیں، تو اس لئے ناکہ انگریزی میں دوسری زبانوں کے شبدوں کو اپنا لینے کی زبردست طاقت ہے۔ فرانسیسی، اطالوی، جرمن زبانوں کی بات تو دور رہی، روسی چینی، اُردو اور ہندی تک کے شبد انگریزی زبان نے اپنا لئے ہیں۔

دیانند:۔ یقیناً (اُٹھ کر میز کا چکر لگاتے ہوئے) میں نے پتاجی کو کئی بار سمجھایا ہے، کہ اس طرح ہندی بھاشا کا دائرہ جسے سارے دیش کی ساجھی بھاشا ہونا ہے،

ایک دم محدود ہو کر رہ جائے گا۔ نہ صرف انگریزی، اُردو کے وہ الفاظ جو ہماری زبان میں رَس بس گئے ہیں، ہمیں اپنائے رکھنے چاہئیں، بلکہ دوسری صوبائی اور علاقائی زبانوں سے بھی چل سکنے والے الفاظ لے کر ہندی بھاشا کو مالدار بنانا چاہیئے، جبھی اس زبان میں قوتِ اظہار، روانی، وسعت، گہرائی اور گیرائی آئے گی اور ہندی راشٹر بھاشا کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری نبھا سکے گی۔

مِردُلا:۔ اور کیا!

دیانند:۔ لیکن اپنے کٹڑپن میں پتاجی سمجھتے ہیں کہ اُردو انگریزی کے الفاظ ہماری غلامی کی یادگار ہیں اور آزاد ملک کو اپنی راشٹر بھاشا سے ان کو ایک دم نکال باہر کرنا چاہیئے۔ جیسے ان الفاظ کو محض ہٹا دینے سے ہماری غلامی کی تاریخی حقیقت مِٹ جائے گی۔ انھیں کیسے بتاؤں کہ اسی تنگ نظری اور پسماندگی کے باعث ہم غلام ہوئے۔ وہ لوگ جو ہندی میں رائج انگریزی اُردو الفاظ کے بدلے نئے نئے شبد گڑھ کر ٹھونس رہے ہیں، کہاوتیں اور محاورے تک بدل رہے ہیں، ملک کے اِتنے ہی بڑے دشمن ہیں جتنے ہندی کو راشٹر بھاشا بنانے کی مخالفت کرنے والے۔

(بات کرتا ہوا اسٹڈی میں آجاتا ہے۔ مِردُلا اس کے پیچھے آتی ہے)

مِردُلا:۔ (ہنستے ہوئے) اور شنکر سونیا کو شدھ ہندی سکھا رہا تھا۔

دیانند:۔ ہاں۔ ہاں۔۔۔

(میز کی دراز سے سیگرٹ نکالتا ہے۔ مِردلا دیاسلائی کی ڈبیا اُٹھا کر اس کا سیگرٹ سلگاتی ہے۔ دیانند کش لیتا ہے)

دیانند:۔ تم تو نئی نئی آئی ہو۔ تمہیں اس بات کا علم نہیں۔ پتاجی کا حکم ہے کہ گھر میں ہر آدمی

شدھ ہندی میں بات کرے۔ نوکر تک شدھ ہندی بولیں۔ آچاریہ کیشوداس اور منڈن مشر کے نوکر نوکرانی جب سنسکرت بولتے تھے تو پنڈت ہرے نرائن مشر کے نوکر کیوں نہ شدھ ہندی بولیں۔

(آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔ مردلا میز والی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جاتی ہے۔

مردلا:- اماں تو ویسی شدھ ہندی نہیں بولتیں۔

دیانند:- اماں کو وہ بھاشن دے دے کر ہار گئے ہیں، مجھ پر اُن کی تعلیم کا جو رد عمل ہوا، وہ تم دیکھ ہی رہی ہو۔ لیکن شنکر کو انھوں نے پوری طرح اپنا چیلا بنا لیا ہے۔ انھوں نے خود اسے ہندی پڑھائی ہے اور اپنے جیسا ہی کٹر بنا لیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، وہ ہمیشہ شدھ ہندی بولنے کی کوشش کرتا ہے۔

مردلا:- ہاں، ہاں میں نے دیکھا ہے۔

دیانند:- کیشوداس اور منڈن مشر کے نوکروں کی مثال دے دے کر پتاجی اسے تعلیم حاصل کرنے اور شدھ ہندی بولنے کو اُکساتے رہتے ہیں۔ اس کا تلفظ ٹھیک کیا کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ میں خواہ ان کا اکلوتا بیٹا ہونے اور ان کا رکھا ہوا نام پانے کے باوجود مہارشی نہیں بنا، لیکن شنکر نوکر ہو کر بھی ایک دن شنکر آچاریہ سا ودوان ضرور بنے گا۔ اور جیسے شنکر آچاریہ نے برہمن دھرم کو نئے سرے سے جمایا تھا، شنکر بھی ہندی بھاشا کا جھنڈا ہر صوبے میں جا گاڑے گا۔ مجھے سنا کر وہ کبھی کبھی شنکر کے بارے میں اپنے سپنے دہرایا کرتے ہیں اور وہ کم بخت اُلّو نمبر ون ہے (ہنستا ہے)، کل وہ سونیا کو چھیڑ رہا تھا۔ جب میں اُدھر جا نکلا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے سونیا نے کہا کہ وہ تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس پر شنکر میاں اُسے ڈانٹ کر بولے کہ وہ شرم سے پانی پانی کیا بک رہی ہے۔ اسے کہنا چاہئے کہ وہ لجّا سے جل جل ہو گئی۔

(مِردُلا زور سے ہنستی ہے)

دیانند:۔ لیکن شنکر میاں غصّہ اور منّت دونوں حربوں سے کام لے کر ہار گئے، مگر اس لڑکی نے لجّا سے جل چل نہیں کہا۔ اب شنکر کو محسوس ہوا کہ وہ شوہر ہے —— اس کی بیوی کو اس کی بات ماننی چاہیئے اور وہ لونڈیا ہے کہ اسے ایک دم بیوقوف سمجھتی ہے۔

مِردُلا:۔ یہ بات ہی بیوقوفی کی ہے۔

دیانند:۔ بیوقوفی کی تو ہے ہی (اٹھ کر سگرٹ کا کش لگاتے اور گھومتے ہوئے) کچھ عجیب سی ضد ہوگئی اسے۔

مِردُلا:۔ ضد بھی کسی واجب بات پر ہونی چاہیئے۔

دیانند:۔ واجب ناواجب کی بات نہیں، شاید حقوق کی بات ہے۔ شنکر شاید سمجھتا ہے کہ شوہر کی حیثیت سے اس کا حق ہے کہ اس کی بیوی اس کی بات مانے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ سر پٹک کر ہار گیا پر سونیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔

مِردُلا:۔ بالکل ٹھیک کیا اس نے۔

دیانند:۔ ان چھوٹی ذات والوں میں شوہر بیوی کا تعلق ویسا تو ہوتا نہیں جیسے ہمارے گھروں میں عورتیں مردوں کے برابر کماتی ہیں۔ بلکہ کئی بار تو عورت مرد کو کما کر کھلاتی ہے۔

مِردُلا:۔ لیکن ہمارے یہاں پتی پتنی کے تعلقات کو محض روپیہ اور کمائی کے ترازو پر تولنا زیادتی ہے۔ ہمارے گھروں میں عورتیں صرف اس لیے شوہروں کا منہ نہیں تکا کرتیں کہ وہ مالی طور پر ان کی محتاج ہیں۔ اس تعلق میں جو روحانیت ہے، پاکیزگی ہے، ایثار اور احترام کا جذبہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔

دیانند:۔ ہاں ہاں، وہ تو سب ہے۔ میں تو صرف ان لوگوں کی بات کرتا تھا۔ احترام ذخرام

کی باتیں یہ مزدور پیشہ لوگ کیا جانیں۔ ان کی زندگی کا محور پیسے کے ساتھ جڑا ہے۔ اب میں جانتا ہوں کہ اگر میں تم سے کوئی بات کہتا تو تم فوراً مان جاتیں۔

مردُولا:۔ مگر تم کوئی ایسی بات کہتے ہی کیوں؟

دیانند:۔ لیکن اگر میں کہتا تو تم مان جاتیں۔ حالانکہ تم اقتصادی اعتبار سے میری دست نگر نہیں ہو۔

مردُولا:۔ تم شنکر تو نہیں ہو جو ایسی بیوقوفی کی بات کر تے۔

دیانند:۔ مرد کبھی کبھی ایسی بیوقوفی کی بات کر جاتے ہیں۔ مگر ہمارے گھروں میں عورتیں ہمیشہ ان کی بیوقوفی کو نظر انداز کر جاتی ہیں اور محبت و رفاقت، ایثار و احترام سے انہیں اپنے بس میں کر لیتی ہیں (آرام کرسی کے ہتھے پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے) اب اگر میں تم سے کبھی ایسی بیوقوفی کی بات کروں تو ۔ ۔ ۔

مردُولا:۔ (بات کاٹ کر) میں تمہاری رفیق کی حیثیت سے سمجھا دوں کہ تمہیں ایسی بات نہ کرنی چاہیئے (ہنستے ہوئے اٹھتی ہے اور کمرے کا چکر لگاتی ہے) میں خواہ اسے بیوقوفی نہ کہوں لیکن ایسی بات کو بہر حال بیوقوفی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آج کے زمانے کی عورت شوہر کو جیت کر اسے مٹھی میں لینا نہیں چاہتی، وہ تو اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھا کر ملک اور سماج کے سلسلے میں اپنی ذمے داریوں کو نبھانا چاہتی ہے۔

(بات کرتی ہوئی کھانے کے کمرے میں آ جاتی ہے اور سائڈ بورڈ سے پانی کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پیتی ہے اور گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے مڑتی ہے۔ مگر دیانند اٹھ کر اس کے پیچھے آ گیا ہے)

مردُولا:۔ تم نے خود شادی سے پہلے کہا تھا کہ میں ایسی بیوی نہیں چاہتا، جو ہر وقت میرا منہ تکتی رہے۔ مجھے ساتھی چاہیئے، رفیقہ چاہیئے، دوست چاہیئے، مشیر چاہیئے۔ کیا اپنی اس رفیقہ، دوست، ساتھی اور مشیر سے تم یہ چاہو گے کہ تم اسے ایک

لغو بات کہہ اور وہ تمہاری خوشی کے لئے اسے پورا کر دے۔

(گلاس خالی ہونے پر اسے میز پر رکھ کر میز کے کونے سے ٹیک لگا لیتی ہے)

دیانند:۔ لیکن اگر میں کہوں

مردُلا:۔ مگر تم کیوں کہو؟

دیانند:۔ تو میں کہہ دیتا ہوں ـــ مردو، میری خوشی کے لئے ایک بار کہہ دو۔ میں لجّا سے جل جل ہو گئی۔

(مردلا زور سے قہقہہ لگاتی ہے اور میز کے دوسری طرف چلی جاتی ہے)

مردُلا:۔ آپ کے سر پر بھی شدّھ ہندی کا بھوت سوار ہو گیا؟

دیانند:۔ نہیں ہندی کا نہیں ...

مردُلا:۔ شنکر کا؟

(پھر ہنستی ہے)

دیانند:۔ ایک بار میری خوشی کے لئے کہہ دو۔ میں لجّا سے جل جل ہو گئی۔

(مردُلا لمحہ بھر کے لئے اس کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر زور سے قہقہہ لگاتی ہے)

دیانند:۔ تو تم نہیں کہو گی؟

مردُلا:۔ (شوہر کی سنجیدگی دیکھ کر خود بھی ایک دم سنجیدہ ہو جاتی ہے) میں جانتی تھی، یہ سب ہو گا۔

دیانند:۔ کیا ہو گا؟

مردُلا:۔ پنڈت جی کی وقیا نوسیت سارے شہر میں مشہور ہے۔ اِن کے خیالات سے کون واقف نہیں؟ اور میں ان کی کٹّرتا سے ڈرتی تھی۔ مگر آپ کالج میں جو لیکچر دیتے تھے، میٹنگوں میں جو خیالات ظاہر کرتے تھے ان سے مجھے معلوم

ہوتا تھا کہ آپ ان سے بالکل مختلف ہیں۔ آپ پر ان کی دقیانوسیت کا شدید ردِ عمل ہوا ہے۔ پھر ہماری ملاقاتیں۔۔۔ آپ کے خیالات۔۔۔ وعدے۔۔۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہماری شادی کو پورا مہینہ بھی نہ گزرے گا کہ۔۔۔۔

دیانند:۔ اس میں خیالات اور وعدوں کو کیوں گھسیٹتی ہو؟ یہ تو۔۔۔۔

مردلا:۔ اور جب میں نے اپنے پتا سے اِس رشتے کا ذکر کیا تھا تو اُنھوں نے انکار کر دیا تھا۔ ہمارے ان کے رہن سہن، طور طریقوں میں بہت فرق ہے — انھوں نے کہا تھا — ہم گوشت کھاتے ہیں، آزاد خیال ہیں، پردے ورے کے بالکل قائل نہیں اور پوجا ودجا میں ہمارا وشواس نہیں۔ مشرجی بڑے کٹر برہمن ہیں۔ تم چار دن میں ان کے یہاں رو دو گی۔ لیکن آپ نے کہا کہ آپ پتاجی کی سنکوں کے قائل نہیں۔ آپ خود گوشت مچھلی سے پرہیز نہیں کرتے۔ پردے کو آپ غلامی کی یادگار سمجھتے ہیں اور عورت کے مساوی حقوق پر آپ کا کامل یقین ہے۔ اور میں آپ کے بھرّوں میں آگئی۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ سب اوپر کی باتیں تھیں۔ دقیانوسیت آپ کو گھٹی میں ملی ہوئی ہے۔

دیانند:۔ اس میں دقیانوسیت کا کیا سوال ہے۔ میں نے تم سے ذرا سی رکویسٹ کی اور تم نے مجھے لیکچر پلا دیا۔ تم نے مجھے اگر اس سے بھی مضحکہ خیز بات کہی ہوتی تو میں فوراً مان جاتا۔

مردلا:۔ میں اگر آپ سے کہوں، کہئے — میں اُلّو ہوں۔ آپ مان جائیں گے؟

دیانند:۔ میں نے تم سے یہ کہا ہے کہ تم اپنے آپ کو اُلّو کہو؟

مردلا:۔ دونوں باتیں برابر ہیں۔ یونہی، بلا وجہ آپ کی ضد پوری کرنے کے لئے میں وہی کہوں، جیسے کہنے کے لئے، شنکر سونیا پر زور دے رہا تھا۔ یہ اُلّو بنانا

نہیں تو اور کیا ہے۔

دیانند:۔ میں نہ جانتا تھا کہ تم میری ذراسی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتیں۔

مِردُلا:۔ یہ ذراسی خواہش کہاں جا کر ختم ہو گی، اسے میں اچھی طرح سمجھتی ہوں

دیانند:۔ کہاں جا کر ختم ہو گی؟

مِردُلا:۔ آپ کی خوشی کے لئے میں یہاں نہ جاؤں، وہاں نہ جاؤں، اس سے نہ بات کروں، اس سے نہ ملوں۔ آپ کے پتا جی کی خاطر میں یہ نہ کھاؤں، وہ نہ کھاؤں۔ آپ کی ماتا جی کو خوش کرنے کے لئے میں یہ نہ پہنوں، وہ نہ پہنوں اور ملازمت چھوڑ کر پیچ، ساس اور سسر کی خدمت کروں اور ایک پتی ورتا استری کے سارے فرائض پورے کرتی ہوئی سورگ میں اپنے لئے سیٹ ریزرو کرا لوں (قدرے گلا بھر آتا ہے) یہی چاہتے ہیں نا آپ؟

دیانند:۔ (تقریباً شنکر کی طرح منت کرتے ہوئے) میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے پھر کبھی کچھ نہ کہوں گا۔ مگر تم ایک بار کہہ دو۔ میں لجا سے جَل جل ہو گئی۔

مِردُلا:۔ تو اسے آپ اپنا حق سمجھتے ہیں۔

دیانند:۔ اگر تم محبت کا حق مانو۔

مِردُلا:۔ یہی آپ کی محبت ہے۔ اور آپ اتنا پیار جتاتے تھے، اتنی میٹھی باتیں کرتے تھے، اتنے آدرش بگھارتے تھے۔

دیانند:۔ تم بھی تو پتی پتنی کے روحانی تعلق کی بات کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ میری خوشی تمھاری خوشی ہو گی۔

مِردُلا:۔ (تقریباً چیختے ہوئے) میں نہیں کہہ سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں کہہ سکتی۔ نہیں کہہ سکتی۔ (کھٹ کھٹ کرتی اسٹڈی میں سے اندر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ دیانند دھم سے کرسی میں دھنس جاتا ہے اور میز پر کہنیاں ٹکا لیتا ہے۔

اسی وقت اس کی نظر گلدان کے باسی پھولوں پر جاتی ہے اور وہ اُٹھ کر
چلاتا ہے)

دیانند:۔ شنکر... شنکر... !

شنکر:۔ جی آیا چھوٹے پنڈت۔ (قریب آکر) جی... جی... !

دیانند:۔ کتنی بار کہا ہے۔ مجھے چھوٹے پنڈت نہ کہا کرو۔

شنکر:۔ جی... جی... !

دیانند:۔ جی جی کیا کر رہے ہو۔ یہ دیکھو گل دان میں پھول کتنے مُرجھائے ہیں۔ صبح صفائی کرتے وقت انہیں باہر نہیں پھینکا جاتا تجھ سے؟ یہ مالی کم بخت کیا کرتا ہے؟ کیوں نہیں اس سے صبح پھول بدلوائے؟

شنکر:۔ جی آدیان[1] پالک آج نہیں آیا۔

دیانند:۔ آدیان پالک کے بچے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟

شنکر:۔ جی یہ بات مجھے گیات[2] نہیں۔

دیانند:۔ تجھے معلوم نہیں تو یہ مُرجھائے پھول کیوں رکھ چھوڑے ہیں یہاں؟ ہٹاؤ یہ سب۔

(زور سے ہاتھ مارتا ہے۔ پھولوں کے ساتھ گل دان بھی گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ شنکر گل دان کے ٹکڑے اُٹھا کر باہر لے جاتا ہے۔ اسی وقت مشر جی کی آواز آتی ہے)

بڑے پنڈتا:۔ دیانند... دیانند!

(دوسرے ہی لمحہ دیانند کے پتا اور اس کی ماں — جو گھر میں بڑے پنڈت اور بڑی بہو کے نام سے مشہور ہیں۔ اسٹڈی میں داخل ہوتے ہیں)

---

[1] مالی [2] معلوم

بڑے پنڈت:۔ (اندر کے دروازے کی طرف دیکھ کر) کہو مہارشی کدھر ہو؟

دیانند:۔ (تنتناتا ہوا آتا ہے) کتنی بار میں نے آپ سے کہا ہے کہ مجھے آپ دیانندیا مہارشی کہہ کر نہ چڑھایا کیجئے۔ میں صرف آنند ہوں۔ ڈی۔ آنند! مہارشی آپ شنکر کو بنایئے۔

بڑی بہو:۔ بہو کدھر ہے دیا، سو تو نہیں رہی؟

دیانند:۔ (روکھے لہجے میں) اپنے کمرے میں ہو گی۔

بڑی بہو:۔ دیکھوں کیا کر رہی ہے۔ اور دیکھو نکرامت شروع کر دینا۔

(چلی جاتی ہے)

بڑے پنڈت:۔ کیوں وتس[1]! یہ مستک پر دھنش وان کیسے چڑھائے ہیں؟

(دیانند جواب نہیں دیتا۔ کہنیاں میز پر ٹکا کر ہتھیلیوں میں سر دے لیتا ہے)

بڑے پنڈت:۔ (آرام کرسی پر براجتے ہوئے) کچھ شنکر سے اپرادھ ہو گیا؟

دیانند:۔ نہیں پتا جی۔

بڑے پنڈت:۔ ودیالیہ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی؟

دیانند:۔ نہیں۔

بڑے پنڈت:۔ بہو سے کچھ کہاسنی ہو گئی؟

(دیانند خاموش رہتا ہے)

بڑے پنڈت:۔ (اس کی خاموشی اثبات کی علامت سمجھ کر) وتس، تمہیں میری بات سے کشٹ ہوتا ہے۔ پر میں تمہارا پتا ہوں اور تمہارے بھاوی[2] دکھ کو لکش[3] کر مجھے بھی اپار ویتھا[4] ہوتی ہے۔ میں آرمبھ[5] ہی سے اس وواہ کے پکش[6] میں نہ تھا۔

---

[1] بیٹا [2] مستقبل کے [3] دیکھ کر [4] نہایت تکلیف [5] شروع [6] حق۔

اور مجھے بھلی بھانت گیات[1] تھا کہ تمہیں شیگھر[2] ہی اپنی اس مورکھتا کا بھان[3] ہوگا۔ ہر پریوار کے رہن سہن کی اپنی پری پاٹی[4] ہوتی ہے اور میری یہ پربل آکانشا[5] تھی کہ میں اس گرہ[6] میں تمہارا وِواہ کروں، جو ہمارے سم ککش[7] ہو اور جس کے آچار وِچار ہمارے سمان ہوں۔ پرنتو تمہیں سویکار[8] نہیں ہوا اور یہ پرنیام[9] کیا ہے؟ وِواہ پشچات[10] ہوا ہے اور دو چوتھے پورو[11] ہو گئے ہیں اور میں پرکٹ لکش[12] کر رہا ہوں کہ دھیرے دھیرے یہ برہمن کا گرہ انگریز کا گرہ ہو جائیگا اور جس وِدیشی سنسکرتی[13] کے وِرُدھ[14] میں جیون بھر کھڑگ ہست[15] رہا ہوں، میری سنتان دوارا[16] اس گرہ میں اس کی پرتشٹھا ہوگی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی میں تمہاری اِچھا کے آگے نت شِر[17] ہوا۔ کنتو جس بات سے میرا ہردے شت شت بھاگوں میں وِدیرن[18] ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر کبھی تم سکھی نہیں ہو۔

دیانند:- (یکایک مڑ کر) مجھ سے غلطی ہوئی۔

بڑے پنڈت:- غلطی نہیں بھول کہو۔

دیانند:- مجھ سے زبردست بھول (بڑے پنڈت پھر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ دیانند ہاتھ اُٹھا کر انھیں روکتا ہے) نہ مجھے روکئے نہیں —— مجھے اپنے دُکھ کی بات بول چال کی بھاشا میں کہہ لینے دیجئے۔ میں نے آپ کی بات نہ مان کر بڑی غلطی کی۔ مردُلا کو تو میری رتی بھر پرواہ نہیں۔ وہ میری چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتی۔

---

[1] اچھی طرح معلوم [2] جلدی [3] احساس [4] طرز [5] زبردست خواہش [6] گھر [7] برابر [8] منظور [9] نتیجہ [10] بعد [11] پہلے [12] صاف دیکھ رہا ہوں [13] تمدن [14] خلاف [15] تیغ بکف [16] اولاد کے ذریعے [17] جھک گیا [18] میرا دل سو سو حصّوں میں ٹکڑے ہوتا ہے

بڑے پنڈت:۔ ہوا کیا؟

(بڑی بہو تیز آتی ہے)

بڑی بہو:۔ بات کیا ہے دیا؟ بہو رو رہی ہے اور سامان باندھے جا رہی ہے۔ میں نے لاکھ پوچھا، کچھ بتاتی ہی نہیں۔

دیانند:۔ اب کیا بتاؤں۔ کل کی ہی بات ہے۔ شنکر اور سونیا کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ شنکر نے اسے چھیڑا۔ میں اوپر سے آ گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ شرما گئی۔ آج کھانے کے بعد میز صاف کرتے ہوئے اسی سلسلے میں سونیا نے کہا کہ وہ تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ شنکر بولا۔ شرم سے پانی پانی کیا بکتی ہو، بولو، لجا سے جل جل ہو گئی۔

بڑے پنڈت:۔ (خوش ہو کر) سادھو وادشنکر[1]۔

دیانند:۔ لیکن شنکر ہر جتن کر کے ہار گیا۔ اس نے غصہ بھی کیا اور منتیں بھی کیں۔ لیکن سونیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔

بڑی بہو:۔ اس کی مت ماری گئی جو سونیا کو بھی سدھ بھاسا سکھانے لگا۔

دیانند:۔ نہیں، اسے لگا کہ وہ شوہر ہے، اگر آج اس کی بیوی اتنی سی بات نہیں مانتی تو کل اور کیا مانے گی۔ اسی بات کو لے کر دونوں سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا، میری بیوی کبھی اتنی چھوٹی سی بات کے لئے ضد نہ کرے گی۔ پر وہ تو سونیا سے بھی چار قدم آگے نکلی۔

بڑی بہو:۔ مردوں کی اکل کو بھی نہ جانے کبھی کبھی کا ہوئے جات ہے۔ جاؤ، جا کر مناؤ اسے۔ وہ رو رہی ہے، جاؤ!

دیانند:۔ اچھا اماں (جانے لگتا ہے۔ پھر یکایک مڑ کر) لیکن اگر اس نے میری اتنی سی

---

[1] شاباش شنکر

بات نہ مانی تو . . . .

بڑی بہو:۔ پیار سے مناؤ گے تو سب مان جائے گی۔ جاؤ !

دیانند:۔ جاتا ہوں۔ پر وہ نہ مانی تو میں بھی نہیں ماننے کا۔

(چلا جاتا ہے)

بڑے پنڈت:۔ کیوں دیوی بڑی میں تم سے کہوں . . .

بڑی بہو:۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے دیوی دیوی نہ بلایا کرو۔ ہم تم کو آٹھوں پہر دیوتا دیوتا کہیں تو کیسا لگے ؟

بڑے پنڈت:۔ تم مجھے دیو کہو تو میں دھنیہ ہو جاؤں۔

بڑی بہو:۔ آج دیو کہنے کو کہتے ہو، کل جن بھوت پکارنے کو کہوگے۔

بڑے پنڈت:۔ ہے ناری ! بھوت پریت والا دیو نہیں۔ دیو کا ارتھ ہے دیوتا۔ تم راشٹر بھاشا بولنے لگو تو . .

بڑی بہو:۔ ابھی تو ہماری اس راشٹر بھاشا نے گھر میں ہی مہا بھارت مچا رکھا ہے۔

(بڑے پنڈت اٹھ کر گھومتے ہیں۔ بڑی بہو سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

بڑے پنڈت:۔ یووستھا[1] میں یہی تو دوش رہتا ہے دیوی کہ مستشک[2] کے بدلے یووک[3] یووتیاں بھاوناؤں[4] کو اپنا پتھ پردرشک[5] بناتے ہیں۔ اب بڑی بہو اپنے بیٹے کی تنک سی بات مان لیتی تو اس کی کون سی مان ہانی ہو جاتی۔ پر ان آدھونیکاؤں[6] میں یہی تو دوش ہے، اپنے ادھیکاروں کے پیچھے پران دے دیں گی پر ادھیکار کیسے ہست گت[7] کئے جاتے ہیں، یہ نہ سمجھیں

---

[1] جوانی [2] دماغ [3] نوجوان [4] احساسات [5] راہبر [6] نئے دور کی عورتیں [7] حاصل کئے جاتے ہیں۔

گی۔ اب تمہیں گھر میں کون سا ادھیکار پراپت نہیں۔ اس درواہ تک میں تم نے میری سمیتی لے لی۔ میں کبھی سہن نہ کرتا کہ وہ میرے سامنے نراورن نشنکھ آئے۔ پر تم نے وہ بھی مجھ سے سویکار کرا لیا۔ یہ گر اُن آدھونیکاؤں کو نہیں آتا۔ اب یدی میں نے کہا ہوتا 'دیوی ذرا کہہ دو۔۔۔ میں لجا سے جل جل ہو گئی۔ تو کیا تم اتنی سی بات پہ وادِ وواد کرنے لگتیں۔

بڑی بہو:۔ (اُٹھ کر) تم کیا ان لونڈوں جیسے مورکھ ہو جو اس بات پہ لڑو گے۔
(بھنناتی ہوئی کمرے میں گھومنے لگتی ہے)

بڑے پنڈت:۔ (اُٹھ کر اس کے پیچھے جاتے ہوئے) ارے نہیں، وہ بات نہیں میں تو ان لڑکیوں کی بات کرتا ہوں جو اپنے پتی کی اتنی سی بات نہیں رکھ سکتیں۔

بڑی بہو:۔ سمجھ دار مرد کو ایسی بات کرنی ہی نہ چاہیے جس پر جھگڑا ہوئے۔ ارے کوئی مہتو کی بات ہوئے تو آدمی ہٹھ کرے، یوں ذرا ذرا سی بات پر ادھیکار جتانے لگے گا تو اُسے کھو بیٹھے گا۔

(بات کرتی ہوئی کھانے کے کمرے میں آجاتی ہے)

بڑے پنڈت:۔ پرنتو ناری یدی پرش کے ہٹھ کی رکشا کرتی ہے تو پراجت نہیں وجیی ہوتی ہے۔ اب یدی ہم تم سے کہیں 'دیوی' تنک کہہ دو۔ میں لجا سے جل جل ہو گئی۔۔۔ تو تم نہ کہو گی؟

بڑی بہو:۔ تم تو ردج ہی بھاسا کے پیچھے ہمیں پریسان کرت ہو۔

بڑے پنڈت:۔ بھاشا کے لئے نہیں، کیا ہمارے لئے تم نہیں کہہ سکتیں میں لجا سے۔۔۔

بڑی بہو:۔ تبھی ہمارے گھر کو لوگ پاگلوں کا گھر کہت ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ دیا اکل والا ہوگا، پر آج معلوم ہو جائے گا کہ وہ بھی۔۔۔

۱؎ رضامندی ۲؎ ننگے منہ ۳؎ بحث مباحثہ ۴؎ اہم ۵؎ مفتوح ۶؎ فتحیاب

بڑے پنڈت:- میرا پُتر ہے رہنستے ہیں، مجھے آج جتنی پرسنتا ہوئی کبھی نہیں ہوئی۔
بڑی بہو:- اور تمہارے لڑکے کا گھر اُجڑ رہا ہے۔ بہو آپن سامان باندھ رہی ہے۔
بڑے پنڈت:- تو تم نہیں کہو گی . . . .
بڑی بہو:- تمہاری سنک اسی طرح جوروں پر رہی تو ساری دنیا کے سامنے مجھے شرم ہے . . . .
بڑے پنڈت:- لجّا سے . . . .

(بہو اٹیچی کیس لئے نکلتی ہے۔ کھانے کے کمرے کے دروازے سے سسر کو دیکھ کر گھونگھٹ ذرا آگے کر لیتی ہے۔ دیانند اس کے پیچھے پیچھے آتا ہے)

بڑی بہو:- (اسٹڈی میں آتی ہے) بہو! دیا!
دیانند:- یہ نہیں مانتی۔

(بہو اٹیچی رکھ کر پھر جاتی ہے اور سوٹ کیس لے آتی ہے)

بڑی بہو:- اچھی بہوئیں جرا جرا سی بات پر لڑ کر گھر نہیں چھوڑا کرتیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے لڑنے کی۔
مِردُلا:- یہ ذرا سی بات نہیں۔ یہ بنیادی حقوق کی بات ہے۔ میں پچھلے پانچ برس سے اپنی لڑکیوں کو اپنے حقوق کے لئے لڑنا سکھاتی آئی ہوں اور میں . . . .
بڑی بہو:- آپن ادھیکار جرا جرسی بات پر تو لینے لگو گی تو . . . .
مِردُلا:- یہ آپ اِن کو سمجھائیے۔

(سونیا آتی ہے)

سونیا:- بہو جی، چائے رکھیں؟
مِردُلا:- مجھے چائے نہیں پینی۔ ان سے پوچھو۔
دیانند:- (کھانے کے کمرے میں آ کر) کیوں آج کیا ہے، جو اتنی جلدی چائے

لانا چاہتی ہو ؟

سونیا:۔ آپ صاب جلدی چائے پی لیں تو ہم کھانا پکائیں۔

دیانند:۔ کیوں، آج کا ہے کی جلدی ہے ؟

سونیا:۔ صاب آپ لوگ آج جرا جلدی کھانا کھائے لیں۔

دیانند:۔ لیکن کیوں کھائے لیں جلدی کھانا ؟

سونیا:۔ آج صاب ہم سینما دیکھے جاب۔

مِردُلا:۔ (کھانے کے کمرے میں آکر) ہم کون ؟ تم اور شنکر ؟

سونیا:۔ جی بہوجی۔

دیانند:۔ کیا تو نے اس کی بات مان لی ؟

(سونیا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

دیانند:۔ ہم نے تمھاری اور شنکر کی بات سُن لی تھی۔

سونیا:۔ سینما دکھاوے کا کہت رہے . . .

مِردُلا:۔ (غصہ سے) اس نے سینما دکھانے کو کہا اور تو نے کہہ دیا۔ میں تجا سے جُل جُل ہو گئی۔ ہے نا ؟

سونیا:۔ ایک ٹھو دھوتی لیا دے، کا کہن ہیں۔

دیانند:۔ تم بہت سمجھدار ہو سونیا۔ ایک دھوتی اور سینما کے پیسے میں تمہیں اور دوں گا اور تم چائے رکھ سکتی ہو۔ ہم آج کھانا بھی جلدی کھالیں گے۔

سونیا:۔ بھگوان آپ کو کھوس رکھے بھیّا۔

(جانے کو ہوتی ہے)

مِردُلا:۔ شنکر سے کہو، بھاگ کر میرے لئے ایک رکشا لے آئے (خود آواز دیتی ہے) شنکر!

دیانند:۔ نہیں، کوئی ضرورت نہیں سونیا (مرڈلا سے) میں اب اپنی بات پر زور نہیں دیتا، کیونکہ تم نے میری بات رکھ لی۔ تم نے ابھی کہا۔ میں لجا سے جل جل ہو گئی۔

مرڈلا:۔ میں نے کب کہا؟ وہ تو سونیا نے...

دیانند:۔ لیکن میری بات پوری ہو گئی اور تم چاہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اُلّو نمبر وَن ہوں۔

بڑی بہو:۔ ایک تم ہی اُلّو ہو کا۔ اور اب جو ہم سے کہتا ہے......

(شنکر آتا ہے)

شنکر:۔ آپ نے مجھے بلایا بہو جی؟

دیانند:۔ تم نمبر ایک کے اُلّو ہو اور ہم سب کو اُلّو بنا دیا۔

بڑے پنڈت:۔ کِنتو وتس، میں تم سے اتینت پرسن[1] ہوں

(پردہ گرتا ہے)

---

[1] لیکن بیٹا میں تم سے بے حد خوش ہوں

ایک درخواست

پچھلے برس کی طرح اس برس بھی میں ۶۷ کی بہترین مطبوعہ شاعری مرتب کر رہا ہوں جو ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی سے اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی شائع ہو گی۔ شاعر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ۱۹۶۷ میں شائع شدہ اپنی بہترین تخلیق مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں اور جس رسالے یا اخبار میں وہ تخلیق شائع ہوئی ہو اس کا حوالہ ضرور دیں۔

پتہ:۔ پرکاش پنڈت A 1582/3۔ نوین شاہدرہ۔ دہلی۔ ۳۲

فیض احمد فیض

کیے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روزِ آشنائی، مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہِ تسکیں، نہ قرارِ شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یار جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیمِ یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیض دل جلائیں، کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

عدم

نیاز و عشق سے لبریز باصفا سجدے
نہ ہوں جو جوش تو سب خونِ مدعا سجدے

ترے دروغ و تصنع کی انتہا نخوت
مرے خلوص و محبت کی ابتدا سجدے

خلوصِ سجدہ میں بھی مدعا تو ہوتا ہے
کہاں سے لاؤں میں بے لوث و بے ریا سجدے

وہ رقص کرتی ہوئی تابناک سرمستی
وہ لڑکھڑاتے ہوئے میکدہ نما سجدے

ادھر فقیہِ محبت کی منفرد لغزش
اُدھر فقیہِ زماں کے ہزار ہا سجدے

زمانہ دیکھ تو لے کیا نماز ہوتی ہے
درِ حبیب سے میرے اُٹھا کے لا سجدے

میں ڈھونڈتا ہوں تحیر سے نامرادوں کو
نکل گئے ہیں کدھر میرے باوفا سجدے

نہ جانے لوٹ کے کب آئیں گے سیاحت سے
وہ گم شدہ، وہ رمیدہ، وہ لاپتا سجدے

نہ بیٹھ صحنِ مساجد میں عمر بھر زاہد
نکل بجا پھینک کے دو چار دلربا سجدے

سفینہ عزم سے چلتا ہے التجا سے نہیں
نہ کر خدا کو بہت میرے ناخدا سجدے

زمانہ سونا بکھیرے کہ سیم چھڑکائے
تو اُن کی راہ گزر میں عدم بچھا سجدے

فضا ابن فیضی

یہ حسیں لب، یہ سیہ زلفیں، یہ پیاری آنکھیں
آپ کو دیکھے کوئی لے کے ہماری آنکھیں

میں بھی موجود ہوں محفل میں، کسے ہوش یہ تھا
نگراں آپ کی جانب رہیں ساری آنکھیں

انقلابات کی خاموش تماشائی ہیں
کاش کچھ بول بھی سکتیں یہ ہماری آنکھیں

ہائے پہنچا یہ کہاں سلسلۂ کاوشِ غم
میرے اشکوں سے ہیں لبریز تمہاری آنکھیں

میکدے آج گھٹاؤں کو ترس جائیں گے
میرے محبوب کی کاجل سے ہیں عاری آنکھیں

جیسے پھیلے کسی دیوار پہ انگور کی بیل
اس طرح اٹھتی ہیں مجھ پہ وہ خماری آنکھیں

زلف ہے بین کی لہروں پہ مچلتی ناگن
تم سپیرن ہو تو جادو کی پٹاری آنکھیں

پی گئیں اشک بنا کر غمِ حالات کو بھی
اور کیا کرتیں بھلا درد کی ماری آنکھیں

یہ تضادات کی رَو کیسی چلی ہے یارو!
چہرے حساس ہیں جذبات سے عاری آنکھیں

عام ہے مشغلۂ کور نگاہی اے دوست
ڈھونڈھ مت وقت کے چہرے پہ ہماری آنکھیں

کتنی صدیوں سے اندھیروں میں سفر ہوتا ہے
اُف یہ رنگین دھندلکوں کی پجاری آنکھیں

بھیگا بھیگا ہے جوانی کے ترشح سے بدن
کشتِ صہبا کی ہیں نکھری ہوئی کیاری آنکھیں

بند کر دو یہ فسانوں کے دریچے سو جاؤ
ہو چلیں ہم نفسو! نیند سے بھاری آنکھیں

اظہر سعید

ہلاکتِ دلِ ناشاد رائگاں بھی نہیں
نگاہِ دوست میں اب کوئی امتحاں بھی نہیں

تلاشِ دیر و حرم کا مآل کیا کہیئے
سکوں یہاں بھی نہیں ہے سکوں وہاں بھی نہیں

تری نگاہ نے کھولا معاملہ دل کا
نظر زباں نہیں رکھتی پہ بے زباں بھی نہیں

اسی کو سارے زمانے سے ہم چھپائے رہے
نہ ایک بات زمانے سے جو نہاں بھی نہیں

ثبوت برق کی غارتگری کا کس سے ملے
کہ آشیاں تھا جہاں اب وہاں دھواں بھی نہیں

نشانِ قافلۂ عمر ڈھونڈنے والو
یہاں تو دور تلک گردِ کارواں بھی نہیں

اختر سعید

یقین نذرِ گماں ہے، زرا سنبھل کے چلو
عجیب رنگِ جہاں ہے، زرا سنبھل کے چلو

سُلگتے خوابوں کی بستی ہے رہگزارِ حیات
یہاں دھواں ہی دھواں ہے، زرا سنبھل کے چلو

روش روش ہے گزرگاہِ نکہتِ برباد
کلی کلی نگراں ہے، زرا سنبھل کے چلو

جو زخم دے کے گئی ہے ابھی نسیمِ سحر
سکوتِ گل سے عیاں ہے، زرا سنبھل کے چلو

سراغِ حشر نہ پا جائیں دیکھنے والے
ہجومِ دیدہ وراں ہے، زرا سنبھل کے چلو

خرامِ ناز مُبارک تمھیں مگر یہ دل
متاعِ شیشہ گراں ہے، زرا سنبھل کے چلو

بجز نگاہ کوئی پاسباں نہیں دل کا
وہ شکل آفتِ جاں ہے، زرا سنبھل کے چلو

نازشؔ پرتابگڈھی

ہم کو صرف اس سے غرض ہے کہ ہمیں یار ملے
اب سرِ بزم ملے وہ کہ سرِ دار ملے

گلستاں والوں میں چند ایسے بھی ہشیار ملے
رہ کے پھولوں میں جو کانٹوں کے طرفدار ملے

یہ نہیں کہتے کہ پھر مصر کا بازار ملے
یوسفِ فن کو مگر کوئی خریدار ملے

ہم نے اُس بزم میں دیکھے ہیں فرشتوں کے پرے
شیخ صاحب کو جہاں صرف گنہ گار ملے

کوئی عالم بھی ہو دیوانے رہے فرض شناس
جو سرِ بزم نہ پہونچے وہ سرِ دار ملے

میرؔ آرام طلب سے جو بڑھی آگے نظر
کچھ میرؔ بھی پسِ سایۂ دیوار ملے ٥

ہے ہر انسان کے لئے زیست کا دروازہ کھلا
جس کو ملنا ہو وہ آ جائے سرِ دار ملے

ہر مورخ کو صلیبوں کے گھنے جنگل میں
کچھ خطاکار ملے، چند گنہگار ملے

ذہن کے شیش محل میں جنھیں ڈھونڈا برسوں
وہ حقائق ہمیں رسوا سرِ بازار ملے

لڑتے رہتے ہیں جو آپ اپنی ہی پرچھائیں سے
عہدِ حاضر میں کچھ ایسے بھی قلم کار ملے

بدنصیبی کی کوئی حد ہے کہ نازشؔ ہم کو
فن تو کچھ بھی نہ ملا، سینکڑوں فن کار ملے

---

٥ ہو گا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اختر ہوشیارپوری

وہ رنگِ تمنا ہے کہ صد رنگ ہوا ہوں
دیکھو تو نظر ہوں جو نہ دیکھو تو صدا ہوں

یا اتنا سُبک تھا کہ ہوا لے اُڑی مجھ کو
یا اتنا گراں ہوں کہ سرِ راہ پڑا ہوں

چہرہ پہ اُجالا تھا کہ بیاباں میں سحر تھی
وہ شخص عجب تھا جسے رستے میں مِلا ہوں

کب دھوپ چڑھی شام ڈھلی کس کو خبر ہے
اک عمر سے میں اپنے ہی سائے میں کھڑا ہوں

ہر روزنِ دیوار کو بھی میں نے چُنا ہے
دیوار کے اُس پار بھی میں جھانک رہا ہوں

جب آندھیاں آئی ہیں تو میں نکلا نہ گھر سے
پتّوں کے تعاقب میں مگر دوڑ پڑا ہوں

یوں پھول گریزاں ہیں مرے لمس سے اختر
جیسے کہیں جلتے ہوئے جنگل کی ہوا ہوں

حباب ہاشمی

کس طرح سے طے ہوگا زیست کا سفر تنہا
ہم بھی ہیں اِدھر تنہا، تم بھی ہو اُدھر تنہا

مارے مارے پھرتے ہیں کیسے در بدر تنہا!
آج تک ہیں گردش میں شام اور سحر تنہا

بیکسی کی لذّت سے آشنا نہیں ہے تو
مجھ کو یونہی رہنے دے میرے چارہ گر تنہا

شہرِ دل سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج کتنی سُونی ہے دل کی رہ گزر تنہا!

کون اپنا ہمدم ہے کون غمگسار اپنا
چھوڑ کر گئے مجھ کو میرے ہم سفر تنہا

کس کی پیروی کیجے کس کو رہنما کہئے
خود بھٹکتے پھرتے ہیں کتنے راہبر تنہا

اے حباب لاکھوں ہیں اہلِ فن زمانے میں
کون آج دیکھے گا آپ کا ہنر تنہا

زاھد فارانی

ہے میرے سر سے کوئی بوجھ اتارنے والا
پکارتا ہے یہ ہر دم پکارنے والا

پھرا ہے یوں وہ رُخ آئینہ نما مجھ سے
کوئی نہیں مری صورت سنوارنے والا

بنا ہوں سینۂ دریا کا بوجھ مدت سے
کوئی رہا ہی نہیں پار اُتارنے والا

بدلتی جاتی ہے حالت زمیں کے چہرے کی
کہ آسماں ہے نیا روپ دھارنے والا

اُتر کے کارگہِ فن میں فتح یاب ہوا
بساطِ دہر پہ ہر روز ہارنے والا

میں اپنے عہد کا صنّاعِ شعر ہوں زاہدؔ
مرا قلم ہے نئے نقش اُبھارنے والا

شمیم حنفی

کچھ تری بے مہریاں ہیں اور کچھ میری خطا ہے
میں کبھی اک پیاسا سمندر، تو کبھی اک خالی گھٹا ہے

ہر طرف منظر بجھے ہیں، خشک پتھریلی زمیں پر
ہر طرف الجھی ہوئی تنہائیوں کا سلسلہ ہے

لوگ تجھ سے دور رہنے کی قسم کیوں لے رہے ہیں
سوچتا ہوں اب یہی کہہ دوں کہ تو میرا خدا ہے

خواب کی زنجیریوں کب تک مجھے رسوا کرے گی
ایک مرجھایا ہوا پتہ کبھی دامن کھینچتا ہے

تیری آنکھوں میں نہ جانے کیا نظر آیا تھا مجھ کو
کیسے بتلاؤں کہ پچھلی شام سے کیا ہو گیا ہے

منیر نیازی

سارے منظر ایک جیسے ساری باتیں ایک سی
سارے دن ہیں ایک سے اور ساری راتیں ایک سی

بے نتیجہ بے ثمر جہد و جہد سود و زیاں
ساری جیتیں ایک جیسی ساری ماتیں ایک سی

سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبارِ زرگری
سب کی دہشت ایک جیسی سب کی گھاتیں ایک سی

اب کسی میں اگلے وقتوں کی وفا باقی نہیں
سب قبیلے ایک ہیں اب ساری ذاتیں ایک سی

ہوں اگر زیرِ زمیں تو فائدہ ہونے کا کیا
سنگ و گوہر ایک ہیں پھر ساری دھاتیں ایک سی

ایک ہی رخ کی اسیری خواب ہے شہروں کا اب
ان کے ماتم ایک سے ان کی براتیں ایک سی

اے منیر آزاد ہو اس سحرِ یک رنگی سے تو
ہو گئے سب زہر یکساں سب نباتیں ایک سی

شکیب جلالی

جاتی ہے دھوپ اُجلے پروں کو سمیٹ کے
زخموں کو اب گنوں گا میں بستر پہ لیٹ کے

میں ہاتھ کی لکیریں مٹانے پہ ہوں بضد
گو جانتا ہوں نقش نہیں یہ سلیٹ کے

دنیا کو کچھ خبر نہیں کیا حادثہ ہوا
پھینکا تھا اس نے سنگ گلوں میں لپیٹ کے

فوارہ کی طرح نہ اگل دے ہر ایک بات
کم کم وہ بولتے ہیں جو گہرے ہیں پیٹ کے

اک نقرئی کھنک کے سوا کیا ملا شکیب
ٹکڑے یہ مجھ سے کہتے ہیں ٹوٹی پلیٹ کے

وقار احمد رضوی۔ ایم۔ اے

ادبی تنقید کا مفہوم

ادبی تنقید ایک فنِ طبعی ہے اور وہ اس وقت سے فطری طور پر حیاتِ انسانی میں موجود ہے جب انسان کو ادراک و شعور عطا کیا گیا۔ یہی وہ قوت ہے جس نے انسان میں ادب کا ذوق اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی۔

ادب اور نقد زندگی کی ناطق قدریں ہیں۔ ادب زندگی کے بطن سے رونما ہوتا ہے اور نقد ادب کی تہذیب اور حسن کاری میں حصہ لیتا ہے۔ وہ زندگی کے تجربات کو پرکھتا ہے اور ان قدروں کا تعین کرتا ہے جو تخلیق کو نور و نکہت اور وجدانی تاثرات کو سائنسی صداقت سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ اس کی آواز کا جادو جب زندگی کے اُفق پر جلوہ ریز ہوتا ہے تو وہ بربطِ حیات کے تاروں کو چھیڑ کر فضا میں نغمہ برسا دیتا ہے۔ وہ عشق کو آگہی اور عقل کو آدابِ جنوں سکھاتا ہے۔ نقد نہ محض علمی صحیفہ ہے اور نہ بے ستون و کوہ کن کی حکایاتِ خونچکاں۔ جب زندگی خارجیت یا محض داخلیت کی تنگنائے سے گزرتی ہے تو نقد خیال کو مادے سے اور مادے کو عینیت سے قریب لاتا ہے۔ وہ زندگی کو اصولِ تغیر اور لامتناہی سلسلے سے ہمکنار کرتا ہے۔ وہ ہیئت و معنی کا حسین امتزاج پیش کرتے ہوئے گردشِ دوراں کو لطافتِ صہبا اور انسان کو زندگی کی آخری صداقت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

نقد چند غیر مربوط کا نام نہیں بلکہ نقد کی بنیاد اصول، ضابطہ اور فہم پر قائم ہے۔ نقد کے اصولوں پر ادب پاروں کو پرکھنے کے بعد کچھ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہیں یا نہیں، یہ دیکھنا بھی نقد ہے۔ کیونکہ متعینہ مفادات کے درمیان جد وجہد اور تصادم کے منطقی نتائج سے بحث کرنا نقد میں شامل ہے۔ فطری طاقتیں تاریخی ارتقا میں اہمیت رکھتی ہیں۔ تحلیل وتجزیہ سے پیدا شدہ حالات، تاریخی عمل سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں یہ بھی نقد کے دائرے میں داخل ہے۔ اس لحاظ سے نقد فن کار کو غیر جانب دار تخلیقی عمل کی طرف لے جاتا ہے۔

نقد ابتدا ہی سے معرضِ وجود میں آگیا تھا۔ ادب اور نقد پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ شاید پہلے شاعر یا ادیب کے بعد ہی پہلا ناقد بھی دنیا میں آیا۔ شروع میں نقد انفعالی تھا۔ شعر کے سلبی طرزِ فہم پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ پھر وہ ایجابی ہوا۔ سلبی نقد تاثرات وجدانی کا دوسرا نام ہے۔ وہ حسن وقبح بیان نہیں کرتا۔ ایجابی نقد۔ تاثرات وانفعالات کے مثبت طریقۂ اظہار کو کہتے ہیں۔ وہ عیوب ومحاسن بیان کرتا ہے۔ ایجابی نقد کے ذریعہ، تاثرات کا شرح وبسط ہوا۔ اس طرح گزشتہ ادوار میں ادب اور نقد کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔

انفرادی یا اجتماعی ذوق، نقد کا ادبی ستون اور ادب کو پرکھنے کی اولین کسوٹی ہے۔ ادب کا فنی مرتبہ متعین کرنے اور ادب کی قدر وقیمت بیان کرنے کے متعلق، ادبی احکام اور فیصلے صادر کرنے کے لئے، ذوق مرجعِ اول ہے۔

نقد ادبی کی پہلی غایت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے کسی ادب پارے کے حسنِ ذاتی قیمت کا اندازہ کرے۔ یہ بات اصولِ نقد یا ان عام خصوصیات سے معلوم ہوگی جن کے لئے ادب یعنی عام ادب اور ادب اپنی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ یعنی ادب کی جو [illegible]ات عامہ ہیں ان کے ذریعہ ادبی عبارت کی ذاتی قیمت کا اندازہ ہوگا۔

یہ ایک ایسی نوعِ توضیحی ہے جو ادب کو سمجھنے اور ادبی ذوق رکھنے میں معاون و مددگار ہوتی ہے۔ یہ نوعِ توضیحی ذاتِ ادب کی قیمت کی وضاحت کرتی ہے۔ ذاتِ ادب کی وضاحت کرنا اور ادب کی خصوصیاتِ عامّہ کا پتہ لگانے کے بعد، اس کا اضافی مرتبہ متعین کرنا، نقد کا دوسرا حصّہ ہے۔ ادب کا اضافی مرتبہ متعین کرنے میں ادیبوں کی درجہ بندی، اور ان کی مختلف تخلیقات کے بارے میں ایک ضابطہ مقرر کرنا — تاکہ وہ موازنے کا پیمانہ بن سکے۔ یہ ایک ایسی نوعِ توضیحی ہے جو ادیبوں میں باہم فضیلت اور برتری قائم کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی عہد کے تمام ادیب، شعور کی ایک ہی سطح پر نہیں ہوتے۔ ان کا ذہن طبقاتی اور سماجی محسوسات کے مختلف حصّوں میں بٹا ہوتا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی فنّی اثر کا صحیح اندازہ کرنا، اس کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے کا نام نقد ہے۔ یا یوں کہئے کہ ادبی نصوص کی ذاتی قیمت اور اضافی مقام کا تعین، نقد ہے۔ پس اصطلاح میں نقدِ ادبی، ادبی عبارتوں کے پرکھنے، ان کا صحیح اندازہ کرنے، ان کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے کو کہتے ہیں۔

نقد کا کام اس وقت شروع ہوتا ہے جب ادب عالمِ تخلیق میں آجاتا ہے۔ ادب پہلے وجود میں آتا ہے، اور نقد انشائے ادب کے بعد اپنا فریضہ انجام دیتا ہے۔ نقد سے یہ بات خود بخود متصوّر ہوتی ہے کہ ادب بالفعل موجود ہے۔ نقد کے توسط سے ادب کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح ادب ترقی کرتا ہے اور نقد اپنے ملکۂ مہذّبہ اور فطری جذبے کی روشنی میں ادب کے بارے میں حکم صادر کرتا ہے۔

نقد کو اس بات کی قدرت حاصل نہیں کہ وہ ادب کو عدم سے وجود میں لائے۔ ادب تخلیق کرنا یا ادبی ذوق اور اس کی چاشنی پیدا کرنا، نقد نہیں۔ نقد میں

تخلیق کی صلاحیت نہیں ہوتی لیکن اچھی تنقید، تخلیقی ادب پیدا کرتی ہے۔ نقد ملکۂ ادب اور اس کی چمک کو بڑھاتا ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ انشائے ادب، ادبی ذوق اور اس کی تنقید یہ تینوں مل کے فطری طور پر بیک وقت کسی ادیب میں پائے جاسکیں۔

ادب، ادیب کا پرتو ہے۔ نقد ادیب کے وجدان کو ٹٹولتا ہے۔ وہ ادیب کے ذاتی احوال و کوائف کو آئینہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ ادیب کی طرح ستاروں پر کمند ڈالنے کے بجائے، انگاروں سے دہکتی اور پنکھڑیوں سے مہکتی ہوئی ادیب کی زندگی کے اسباب و علل تلاش کرتا ہے۔ وہ ادیب کے ذہن کا مطالعہ کرتا ہے جہاں داخل کی گہرائیوں سے نکلنے والے ادب نے جگہ پائی ہے۔ وہ تاریخی ماہیت سے سوز دروں کی مطابقت کا اندازہ لگاتا ہے جس نے ادیب کے ذوقِ جمال کو استوار کیا اور قوتِ تاثیر کو نمو بخشی۔

نقد مادی ارتقاء اور ادبی شعور سے بحث کرتا ہے۔ یہ تجرباتی طریق کار ادیب کے لئے حقیقت کی تفتیش اور انکشاف کا وسیلہ بنتا ہے۔ نقد منطقی قیاس اور استدلال کو عملی زندگی میں حسن اور مسرت کے اضافے سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ ادیب کے لاشعوری عمل کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے۔ وہ حیات و کائنات کا عمیق مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے پاس کائنات اور زندگی کے ارتقاء اور تاریخ کا منضبط علم ہے۔ نقد۔ معاشرتی حدوث و ارتقاء کی ایک تاریخ ہے۔ وہ تخلیق کو جدلیاتی ماہیت، اور فن کار کو خارجی اسباب و صور کے درمیان جدوجہد و پیکار پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ فن کار کے ضمیر سے دوئی اور تضاد کو مٹاتا ہے۔ وہ تاریخی جبریت کا شکار نہیں ہوتا اور اپنے اندر اجتماعی اور انفرادی ارادے کو یکساں طور سے کار فرما ہونے دیتا ہے۔ وہ فن کار کو مادی اور ارضی زندگی کی اصلیت اور جسم و جان کے نازک رشتے کا احساس دلاتا ہے۔

ادب ماحول اور شخصیت سے پیدا ہوتا ہے۔ نقد ادب کے افادی اور جمالیاتی پہلوؤں پر نگاہ ڈالتا ہے۔ وہ خیال کی پاکیزگی کے ساتھ اسلوب کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے بظواہر اگر غیر واضح ہوں تو احساس کی سفلی جبلت، وحشیانہ جذبات کی عکاسی کرنے لگتا ہے۔ نقد فکر و فن دونوں کا مجموعہ ہے۔ وہ واضح اور مرتب فکر سے فن میں نکھار اور تنظیم لاتا ہے۔ وہ خیال و تجربہ سفلی عمل کو زندگی کی لطافتوں سے مانوس کرتا ہے، جذبات کو آسودگی کے بجائے ذہن کی بیداری اور فلسفہ یا نظام تعمیم کو تجریدی مماثلت کی طرف لے جاتا ہے۔

نقد ___ طبیعات اور کیمیائی طرح تجرباتی علوم (Practical Science) میں سے نہیں ہے۔ اور نہ اس کا شمار علوم ریاضی۔ حساب۔ ہندسہ۔ جبر المقابلہ میں ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام علوم وضعی ہیں۔ نقد ___ عقلیت اور سائنسی مزاج کو ذوق و وجدان اور شاعر کے احساسِ جمال سے بہرہ ور کرتا ہے۔

جہاں تک نقد کا تعلق ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ اس کا ایک حصہ وضعی ہے۔ اس میں عمومیت ہے۔ اور نحو، بیان اور ذوقِ عمومی کو دخل ہے۔ نقد کا دوسرا حصہ شخصی ہے۔ اس کا سارا دار و مدار انفرادی ذوق یا ذوقِ خاص پر ہے۔ ہر فرد کا ذوق اس کا اپنا ذوق ہوتا ہے۔ اس میں غیر کو دخل نہیں ہوتا۔ احساس، زندگی کے ارتقائی عمل سے ہر لحہ بدلتا رہتا ہے۔ ادبی ثقافت اور طبیعی عناصر کے اشتراک سے مشترک اقدار راہ پاتی ہیں۔ اس اعتبار سے ادبی تنقید خالص علوم کے دائرے سے نکل جاتی ہے۔ کیونکہ ادبی تنقید میں ذوق خاص کو دخل ہوتا ہے اور وہ زندگی کی تفسیر اسی پہلو سے کرتا ہے جس طرح ادیب یا شاعر نے حیات و کائنات کی ترجمانی کی ہے یا جیسے شاعر کی طبیعت اور اس کے مزاج نے زندگی کو سمجھا ہے۔

نقد خالص فن بھی نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ فن ادب، ذاتیت سے بحث کرتا ہے اور زندگی کو ادیب کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ادب یا ادبی تنقید، شخصیتِ ادیب کا عکس ہوتی ہے۔ زندگی ادیب سے جو چاہتی ہے لکھواتی ہے اور فن کار اپنے جذبات اور خیال کے مطابق جیسا چاہتا ہے، زندگی کی مصوری کرتا ہے۔ اس اصول کے پیش نظر نقد کی تین شقیں ہوئیں۔

۱۔ نحو، معانی، بیان ۲۔ نثر و نظم ۳۔ فلسفہ، نفسیات اور فنی اصول۔

پس نقد علم خالص اور فن خالص کے درمیان ایک شے ہے جو ان دونوں جانبوں میں سے کسی ایک ہی کی طرف نہیں جھک سکتا۔

نقد۔ عقلی ثبوتیت کو زبانِ دلبری اور حدیثِ قدسی کو تجربہ و ادراک کا ایمائی شعور دیتا ہے۔ وہ ارتقا بالضد کے نظام میں زندگی کے حرکی تصور اور عملی التزامات کا پیامبر ہوتا ہے۔ وہ ذہن کی وسیع کائنات میں لاشعور کو تعبیر سے، شعر کو آہنگ سے، روح کو تصوریت سے ملاتا ہے۔ اور روایت کو ماضی کی عظمت پارینہ کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔ نقد۔ لکھنے والے کے شعور اور خیالات کو غور سے پڑھتا ہے۔ وہ سماج کے دوسرے افراد تک شاعر یا ادیب کی بات پہنچانے میں افہام و تفہیم کا ذریعہ بنتا ہے۔ وہ شعر کی تشریح بھی ہے اور اس کی توجیہہ بھی۔ وہ ادیب کے اجتہاد کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے۔ اور ادب سے مادی ضروریات اور اخلاقی مطالبات پورا کرنے کے بارے میں مواخذہ بھی کرتا ہے۔ نقد۔ تحسین و تقریظ نہیں اور نہ تحسین و تقریظ کو بڑی تنقید کہا جاسکتا ہے۔

تنقید ایک سماجی عمل ہے اور ناقد ادب کی محسوساتی دنیا میں ایک ادبی پارکھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناقد۔ ادب پاروں کو نقد کی کسوٹی پر کستا ہے

اور نقد کے اصول و مقاییس کی روشنی میں ان کو پرکھتا ہے۔ وہ کھرے کھوٹے میں تمیز کرتا ہے۔ اچھے ادب کی تخلیق میں ادیب کے ذاتی مشاہدہ سے زیادہ ناقد کی بصیرت کو دخل ہے۔ اچھی تخلیقی قوت، اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔ تنقیدی شعور۔ تخلیقی استعداد کے زیر اثر ہی نشو و نما پاتا ہے۔ ایک اچھا ناقد تیز ادراک، زندہ احساس، وسعتِ نظر اور عمیق دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنی تنقید میں شرافت و مروّت کے بجائے تنقیدی بالغ نظری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کا آفاقی ذہن غیر جانبداری، مقدّس سنجیدگی اور خیال و مادہ کی شعوری آویزش سے مربوط ہوتا ہے۔ ناقد انسان کے عنصری عواطف اور نفسِ انسانی کی بنیادی کیفیات سے اس طور پر بحث کرتا ہے کہ یہ چیزیں ہمہ گیر ہیں۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ ابدی ہیں۔ تنقید میں جذباتی تحلیل سے وسعتیں اور گہرائیاں آتی ہیں۔

ناقد کا ذہن داخلی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ خارجی حقیقتوں سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ ناقد میں تنقیدی صلاحیت عصری میلانات سے الگ ہٹ کر اُجاگر نہیں ہوتی۔ فرد کی شخصیت اور فرد کی زندگی ایسی چیزیں ہیں جن کا تصور سوسائٹی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ادب کا خارجی حالات سے براہِ راست اور گہرا تعلق ہے۔ ناقد کی زندگی بھی جماعتی پس منظر سے انسلاک رکھتی ہے۔ ناقد کی شخصیت میں مادّی جدلیت یا تاریخی مادیت، لازمی شرط قرار پاتی ہے۔

ناقد کا ثاقب النظر، سریع الخاطر اور مہذب الذوق ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ادیب کے ساتھ میلانِ طبع اور اس کے فطری جذبے میں شریک رہے۔ ایک اچھے ناقد میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اُس ذہنی کیفیت کو پلٹنے کی کوشش کرتا ہے جو مصنف یا تصنیف کی ہے۔ وہ اپنے ذوق کو چھوڑ کر ادیب کے ساتھ ہل جاتا ہے۔ وہ قدرداں کا نبّاض اور تجربات کا مبصر ہوتا ہے۔

یہ سب موثرات ناقد کی زندگی میں ثقافتِ علمی و ادبی سے پہلے ہیں۔ ثقافت علمی و ادبی کا درجہ بعد میں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موثرات فطری ہوتے ہیں اور ثقافت علمی و ادبی کسبی ہے۔ ناقد میں ثقافتِ علمی و ادبی، ادب کی مشق و مہارت کے کلاسیکی لٹریچر پڑھنے، علوم و فنون پر گہری نظر اور تاریخی ادوار کے مطالعہ سے آتی ہے۔ اس ثقافت اور ذوقِ خاص کے امتزاج سے ناقد میں ثقاہتِ علمی و ادبی بیدار ہوتی ہے۔ اگر یہ سب چیزیں کسی ناقد میں جمع ہو جائیں تو اس کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہوگا اور وہ صحیح معنوں میں تنقیدی بصیرت کا حامل ہوگا۔

نقد کے اصولی سرچشموں یا عناصر ادبی ۔ جذبہ[1]، فکر[2]، خیال[3] اور ہیئت[4] میں جذبہ کو فوقیت حاصل ہے۔ جذبہ ایک اہم عنصر ہے۔ تمام چیزوں میں جذبہ کی قوی تاثیر ہے۔ عاطفہ خیال کو پیدا کرتا ہے اور خیالی تصویروں کو اُبھارتا ہے۔ پھر حقائق کو زندہ کرتا ہے۔ جذبہ ایک خوب صورت اور مترنم زبان کو جنم دیتا ہے۔ وہ ادب میں شعر یا نثر کا روپ دھارتا ہے۔ جذبہ ایک خیال مصوّر کو مستلزم ہے اور خیال کو واضح طور پر سامنے لاتا ہے۔ فکر تجرید پسند ہے مگر جذبہ ہمیشہ لباس کا متقاضی ہے۔ جذبہ تخلیق کا محرک ہے۔ جذبہ میں ایک حد تک خیال کی کارفرمائی ہے۔ جذبہ کے آہنگ سے نغمے کے آہنگ کی تخلیق ہوتی ہے اور نغمہ کے آہنگ سے جذبہ کی تہذیب ہوتی ہے۔ جس طرح عقل، صداقت کی اور ارادہ نیکی کی تخلیق کرتا ہے اسی طرح جذبہ عالمِ فطرت اور عالمِ انسانی میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ ماہیت کے اعتبار سے احساس اور جذبہ الگ الگ نہیں۔ احساس جب تک جذبہ کا جزو نہ بن جائے اُس وقت تک وہ آرٹ کی تخلیق کا باعث نہیں ہو سکتا۔ جذبہ پر جب تخیل کی ضرب لگتی ہے تو اس میں سے روشنی کی کرن پھوٹ پڑتی ہے۔

علمائے نقد اس بات پر متفق ہیں کہ سب سے اچھا ادب وہ ہے جس میں

خطائے فکری نہ ہو۔ جذبات کی سچی عکاسی ہو۔ نقد میں اہم چیز ذوقِ خاص ہے۔ ذوق سب کا ایک نہیں ہوتا۔ ذوق کے پیمانے سب کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا نقد کسی خاص اصول یا ضابطے کا پابند نہیں۔ اس کا مزاج مختلف الالوان ہے۔ نقد کے اصول مشکل نہیں اور نہ نقد میں نحو، بلاغت کی طرح تفصیلی قوانین ہیں۔ نقد کے قوانین عام اور لچکدار ہیں۔ ان کا تعلق ہر فرد کے ذوق سے ہے۔ وہ اصول شخصیت کو فنا نہیں کرتے بلکہ شخصی اثرات یا شخصیتوں کو اپنے احاطے میں لے لیتے ہیں۔ ہر فن کا صحیح فلسفہ فی الواقع سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ذوقِ سلیم کی منطقی شرح ہے۔ ذوقِ سلیم اس فن کے فلسفہ تک پہنچاتا ہے۔ جذبہ کی سچائی، خیال کی رعنائی، فکر کی گہرائی اور اسلوب عناصرِ ادبی ہیں۔ یہ ارکانِ ادب ہیں۔ اور آپس میں اتصالِ کلی رکھتے ہیں۔

پاکیزہ ذوق ادب کو سبک اور لطیف بناتا ہے۔ علوم نفس، آرٹ، موسیقی اور فلسفہ ذوق کو درست کرتے ہیں۔ نقد کے پاس ان میں سے ہر چیز کا کچھ نہ کچھ حصّہ ہے۔ نقد کے مقابیس کچھ چیزوں کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ کلام یا ادب میں حسن، قوت اور وضاحت پیدا کرتی ہیں۔ وہ ادب کو کامل ترین فن کا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں اور اس کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ حیات و کائنات پر اثر انداز ہو سکے۔

زبان مواد کو طبیعت سے اخذ کرتی ہے۔ اور اجزا کو بطریق تشبیہ و استعارہ ترتیب دیتی ہے۔ یہ لغتِ خیالی ہے۔ جب نثر یا دوسری عبارتیں، غایت ادبی کو پانے سے عاجز ہو جاتی ہیں تو خیال ہی ایک ایسی طاقت ہے جس کے ذریعہ جذبہ احساس کی صحیح ترجمانی کرنے لگتا ہے۔ معاشرے میں جذبے اور تخیل کی قوت اور خیال اور آواز کی ہم آہنگی سے جوہری توانائی اُبھرتی ہے۔ اعلیٰ آرٹ کی تخلیق نہ خالص فکری انسان کر سکتا ہے اور نہ خالص جذباتی انسان۔ اس جمالیاتی توازن میں زندگی

کے توازن کا اشارہ ملتا ہے۔ جذبہ کی حرکت اندر سے باہر کی جانب ہوتی ہے۔ فکر کی حرکت باہر سے اندر کی طرف ہوتی ہے۔ عقل کی دُنیا خارجی ہے اور جذبہ کی دُنیا اندرونی۔ ذہن کے حرکی اجزا تصورات نہیں، جذبات ہیں۔ تصورات، جذبات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ زندگی عقل اور خیال، فکر اور جذبہ سب پہ حاوی ہے۔ اس میں خرد کی بخیہ گری اور جنون کی پردہ دری دونوں کے جلوے نظر آتے ہیں۔ زلیست کا نظم و ضبط عقل کا رہین منت ہے، پر زلیست کا مزہ جذبہ کے بغیر ممکن نہیں۔

شاعر کے دل میں غم و غصہ، نشاط و خوشی کے جذبات آتے ہیں۔ ناقد اس احساس کے دواعی اور اسباب کا پتہ چلاتا ہے۔ وہ تلاش و جستجو سے اسباب کی حقیقت کو پا لیتا ہے۔ وہ عبارت کی تحلیل عملی سے اس عنصرِ عقلی یا فکر کا سراغ لگاتا ہے جو نقد کا تیسرا اصول ہے۔

تعبیرِ حقائق کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسا اسلوب اختیار کیا جائے کہ اس کا اثر قاری کے ذہن پر پڑے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ قاری کا ذہن نقد کی کسوٹی ہے۔ جذبہ قاری کے دل میں ادبی قوتِ تاثیر سے پرورش پاتا ہے اور وہ مقیاسِ نقدِ ادبی کا کام دیتا ہے۔ قاری کا ذہن ناقد کے مماثل ہے۔ تخلیق کے پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ وہ تخلیق کیسی ہے؟ نقد کے باب میں قاری کے تاثر ہی کو معتبر سمجھا جائے گا۔ تاثر بھی علم کا ایک ماخذ ہے۔ یہ علم محض قضایا کا مجموعہ نہیں۔ اس میں اجزاء کے بجائے کل حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہاں جذبہ، ذہن کی مدد سے اپنی اندرونی شدت کو خارجی عالم پر ظاہر کرتا ہے۔ تاثر و احساس ـــــ شعور یا تحت شعور کی قوتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور اپنے دامن کو اس کے پھولوں سے بھر لیتے

ہیں ورنہ زندگی کے حقایق کو صاف اور واضح خطوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ اور ذہن عملی اغراض کے تحت، وجود کی گہرائیوں سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔

تعبیرِ حقایق کے لئے تشبیہہ و استعارہ، کنایہ و بدیع کی زبان درکار ہے۔ اس سے معانی کے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلوب ایک اندرونی راگنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں آواز کا زیر و بم اور اُتار چڑھاؤ ہے۔ اس اندرونی راگنی کے آثار انسانی جسم میں انبساط و انقباض کی شکل میں عیاں ہوتے ہیں۔ اسلوب اپنے احساسِ جمال سے ہیئت و معنی کے خاکدانِ تیرہ کو آب و رنگ دیتا ہے۔ وہ اظہار کی تمام لطافتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ اسلوبِ زندگی کا امین و رازدان ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ کاروانِ حیات، عمل اور حرکت کی راہ میں گامزن ہو۔ اور جذبہ یا خیال، تسجیلِ خالد کے لباس میں مزین نظر آئے۔

تخیّلی فعل، جذبہ کا علامتی رمز ہے۔ جذبہ خواہش یا تمنا کا اظہار ہے۔ آرزو کے جذباتی شعور میں تخیّلی شعور بھی موجود رہتا ہے۔ لفظ اور معنی کے ربط سے حسنِ ادا کی زینت آرائی ہے۔ طرزِ ادا کا انحصار لفظ اور معنی دونوں پر ہے۔ الفاظ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہے۔ ہر لفظ ایک جوہری انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ جذباتی شعور کے لئے ان سے ایک طرح کی تجدیدِ عمل میں آتی ہے۔ فکر، تخیّل اور جذبے کی ہم آمیزی رمز و ایمار کا اسلوب ہے۔ اس میں اندرونی تجربے کی گہرائی بھی ہے اور خارجی جماعتی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل بھی۔

نقد کی نگاہ میں ادب رفیع، اقدارِ اعلیٰ کا مبلغ ہے۔ اس پر تہذیب نفسی غالب ہے۔ وہ انسانوں کو دل آزاری کا نہیں، سرور و نشاط کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ یہ خصوصیت اچھے ادیب ہی کی نہیں، تمام فنونِ جمیلہ کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادیب یا انسان اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اپنے نفس کو غم و آلام کی آماجگاہ بنائے، بجز اس کے کہ خود ادیب ہی کا ذہن غیر صحت مند ہو۔ اس کی فکر جنسیت زدہ ہو، اس کی حسِ مردہ

ہو۔ اور وہ زندگی کو شر اور گناہ کا زائیدہ تصوّر کرتا ہو۔

ادب کا موضوع طبیعت اور انسان ہے۔ نقدِ ادبی کا موضوع نظم و نثر ہے۔ ادب عقل و شعور کی مصوّری کرتا ہے۔ نقد کا تعلق، اس کی شرح، تحلیل و تجزیہ، معائب و محاسن سے ہے۔ اصولِ لغت اور قوانین نقد کا پورا احترام، نقد کی پاسبانی سے عبارت ہے۔ نقد۔ فکر و تعبیر کی راہوں میں ایک شمع ہے۔ اور تخلیقی ادب کی تاریخ میں معاشی زندگی کا ایک شعبہ

سردار جعفری

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اِس ظلمات میں

تین اور چراغ گُل ہو گئے۔

۱۶ اپریل کو شاہد لطیف کا انتقال ہوا۔ پھر آخر مئی میں شاہد احمد دہلوی کے انتقال کی خبر ملی اور اب معلوم ہوا کہ مرزا جعفر علی خاں اثر بھی چل بسے۔ موت کی عمل داری بمبئی، لاہور، لکھنؤ ہر جگہ یکساں ہے۔

حضرت اثر قدیم نفاست، شرافت اور شائستگی کا نمونہ تھے۔ ایسے لوگ اب زمانہ پیدا نہیں کرے گا۔ غزل کی پرانی روایت کے علمبرداروں میں اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ لکھنؤ کے کشمیری محلے میں رہنے کے بعد بھی وہ میر کی زبان کے عاشق اور غالب کے بیان کے دل دادہ تھے۔ شاید اس میں اُنھیں اپنے استاد عزیز لکھنوی کے ذوق سے بھی کچھ ورثہ ملا ہو لیکن میر کو بڑا شاعر مانتے تھے، اور غالب کے بہترین اشعار کو میر کی خوشہ چینی سمجھتے تھے۔ میر پر اُنھوں نے متعدد مضامین لکھے اور ایک انتخاب بھی دو جلدوں میں شائع کیا۔

زبان اور فن کے رموز و نکات سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور اس رکھ رکھاؤ کو شاعری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ تنگ نظر نہیں تھے پھر بھی زبان اور بیان کی خامیوں کو معاف نہیں کرتے تھے۔ جب "روپ" کی رباعیاں چھپیں تو فراق سے ایک معرکہ بھی ہوا جو برسوں چلتا رہا۔ اُنھوں نے محاورے اور زبان کے سلسلے میں 'نور اللغات' پر بھی نکتہ چینی کی۔ اس کے کچھ حصّوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن حضرت اثر کی زبان دانی کا سکّہ مسلّم ہے۔

اُن کے ادبی اختلافات ہمیشہ نیک دلی اور خلوص پر مبنی ہوتے تھے۔ یوں تو مغربی ادب سے بھی واقف تھے لیکن ذوقِ سخن اُردو اور فارسی کی کلاسیکی روایت کا دلدادہ تھا۔ ترقی پسند تحریک سے اُنھوں نے شدید اختلاف کیا اور سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں نیا ادب کے اوراق پر اُن کے اور سجاد ظہیر کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ اس آویزش میں کئی معرکے کے مضامین شائع ہوئے۔ لیکن یہ اختلاف صرف ادبی سطح تک تھا۔ اس میں ذاتی تلخی کا دور دور کہیں اثر نہیں تھا۔ سجاد ظہیر سے اور ہم لوگوں سے مرحوم کے مراسم ہمیشہ خوشگوار رہے۔ ہم ادب سے ملتے تھے اور وہ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود ترقی پسند شاعری کے بعض حصّوں کو سراہتے بھی تھے۔ مجازؔ کو اُنھوں نے اس طرح داد دی کہ "اُردو ادب میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے بھیڑیے اُٹھا لے گئے۔" جب سنہ ۱۹۴۷ء میں میری طویل نظم "نئی دنیا کو سلام"، شائع ہوئی تو آثر صاحب نے دل کھول کر داد دی۔ اس پر ایک طویل مضمون لکھا اور اس کے حرفِ اوّل اور حرفِ آخر کی زمین میں خود بھی طبع آزمائی کی اور آخر سنہ ۱۹۴۷ء میں ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور مشاعرے میں وہی چیز مجھے مخاطب کر کے پڑھی فیضؔ کی شاعری بھی اُنھیں بہت پسند تھی اور ایک نظم اور اس کی امیجری پر بڑا خوبصورت مضمون لکھا۔

ایسی اصول پرستی اور ایسی فراخ دلی ان کی شخصیت کی پاکیزگی پر شاہد ہے۔ ان کی کتابیں ہمارے ادب کا ایک بیش بہا سرمایہ ہیں جن سے آنے والی نسلیں زبان، بیان، شعر اور فن کے بہت سے رموز اور نکات سیکھیں گی۔

شاہد احمد دہلوی کے ساتھ دلّی کی ایک روایت ختم ہو گئی۔ ایک دَور قبر میں اُتر گیا۔ اب میرؔ اور غالبؔ۔ ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے پوتے شاہد احمد کی دلّی باقی نہیں ہے۔ ایک دوسری دلّی نئے حُسن کے ساتھ اُبھر رہی ہے۔

گُل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دلّی　　گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رُخانِ پنجاب

اور یہ نئی دلّی کراچی اور لاہور کی طرح شاہد احمد دہلوی کے سوگ میں شریک ہے

شاہد احمد کی زندگی ادب اور موسیقی سے عبارت تھی۔ دلّی کی زبان اور ہندوستان کی موسیقی وہ دونوں کے عاشق تھے اور ان کے تمام اسرار و رموز سے واقف۔ انھوں نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ لیکن غالباً اُن کا سب سے بڑا کارنامہ رسالہ "ساقی" ہے جو انھوں نے ۱۹۳۰ء میں جاری کیا تھا۔ ساقی کا شمار اُن رسالوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد میں ادیبوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری اور بہت سے ادیب اس اُفق سے طلوع ہوئے۔ جن ادیبوں کی شخصیت اور تحریروں سے عصمت چغتائی متاثر ہوئی ہیں، ان میں شاہد احمد بھی ہیں۔ "ساقی بکڈپو" نے بھی اُردو ادب کی بڑی خدمت کی اور ڈیڑھ دو سو کتابیں شائع کیں۔

لیکن جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد دلّی اُجڑی تو ساقی اور ساقی بکڈپو اور شاہد احمد نے بھی دلّی کو خیرباد کہا اور یہ دلّی کراچی میں جا بسی جہاں اتفاق سے "ساقی" اور شاہد احمد کو وہ فراغت نصیب نہ ہو سکی جو دلّی میں تھی۔ یوں تو شاہد احمد کو پاکستان میں اعزاز بھی ملا اور ادیبوں کی تنظیم میں اعلیٰ مقام بھی لیکن ساقی اپنی پچھلی اہمیت کھو چکا تھا۔ شاید اسی درد نے شاہد احمد کے یہاں تھوڑی سی تلخی پیدا کر دی تھی۔

وہ بہت حسّاس تھے۔ ایک بار جوش ملیح آبادی نے ڈپٹی نذیر احمد کی زبان پر اعتراض کر دیا اور شاید کہیں کہیں تصحیح بھی کر دی۔ اس پر شاہد صاحب اتنے برہم ہوئے کہ انھوں نے جوش کی شخصیت اور شاعری کے خلاف "ساقی" کا ایک ضخیم نمبر شائع کر دیا۔ یہ "افکار" (کراچی) کے جوش نمبر کے بعد شائع ہوا اور اس اعتبار سے ایک اہم دستاویز ہے کہ آنے والی نسلوں کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس عہد کے ایک عظیم شاعر کے خلاف کیا کہا جاتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے بعد وہ اس تحریک کے سرگرم طرفداروں

اور کارکنوں میں تھے۔ جب دار وگیر شروع ہوئی تو شاہد صاحب نے تحریک سے کنارہ کشی کرلی لیکن ترقی پسند ادیبوں سے ان کے دوستانہ مراسم برقرار رہے اور ان کی کتابیں ساقی بُک ڈپو سے شائع ہوتی رہیں۔

آج شاہد احمد دہلوی ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اُن کی تحریریں زندہ ہیں اور ان میں دلّی کی ٹکسالی زبان کے نادر نمونے ہمیشہ باقی رہیں گے۔ وہ زبان جو اب دلّی میں نہیں بولی جائے گی۔ جو تھا، نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ

شاہد لطیف کی موت میرے لئے ایک ذاتی صدمہ ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ عصمت چغتائی کے شوہر تھے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ میرے گنے چنے چار پانچ عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ ہم نے زندگی کے تقریباً تیس سال ساتھ گزارے تھے۔ بمبئی میں بہت سے پرانے احباب جمع ہیں اور شاہد اکثر ایک "جشن احباب" منانے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔

میں ۱۷ اپریل کو صبح آٹھ بجے دہلی سے بمبئی واپس آیا تو اسٹیشن پر سلطانہ ملیں۔ اُن کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ کل رات حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے شاہد لطیف کا انتقال ہو گیا۔ جب میں عصمت چغتائی کے گھر پہنچا تو شاہد کو کفن پہنایا جا چکا تھا۔ لاش کے قریب جانے کی ہمت مجھ میں باقی نہیں تھی۔ عصمت سے ملنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ نہ جانے مجھے یہ کیوں خیال آیا کہ جس بہادر اور بے باک عصمت چغتائی سے میں واقف ہوں اس کے آنسو مجھ سے نہیں دیکھے جا سکیں گے۔

میں نے شاہد کے چہرے کی آخری جھلک قبر میں جھانک کر دیکھی۔ قبرستان سے واپس آیا تو ڈرتے ڈرتے عصمت کے قریب گیا۔ تمام احباب جمع تھے اور وہ نہایت سنجیدہ وقار کے ساتھ گردن جھکائے بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر عصمت نے صرف اتنا کہا کہ: "اب کسے الزام دیا کروں گی"۔

اور اس کے بعد اُن کے الفاظ آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"میں پہلی بار شاہد لطیف سے ۱۹۳۴ء میں ملا تھا۔ اُسی شام کو میری ملاقات مجاز اور منٹو سے ہوئی تھی۔ تینوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم تھے اور تینوں بغاوت اور انقلاب کی آگ میں جل رہے تھے۔ منٹو اور شاہد ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور دونوں افسانہ نگار تھے۔ اُس وقت تک ترقی پسند مصنفین کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ لیکن فضا میں چنگاریاں سی اُڑ رہی تھیں۔ منٹو اور شاہد نے مجھے جلیانوالہ باغ اور بھگت سنگھ پر کتابیں پڑھنے کو دیں اور مجھے گورکی سے آشنا کیا۔ ہم تینوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنے کی اسکیم بنائی اور شاہد لطیف نے اس کا نام "نیا ادب" تجویز کیا۔ پانچ چھ برس بعد جب یہ رسالہ لکھنؤ سے نکلا تو شاہد لطیف مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کر رہے تھے اور منٹو بمبئی میں فلموں میں کام کرنے چلے گئے تھے۔ ان دونوں کے بجائے سبط حسن اور مجاز نے میرے ساتھ مل کر لکھنؤ سے "نیا ادب" نکالا۔ اب مجاز لکھنؤ کی خاک میں سو رہا ہے اور منٹو لاہور کی مٹی میں اور شاہد لطیف بمبئی میں۔ زندگی کس طرح انسانوں کو بکھیرتی ہے اور موت کس طرح انھیں چن چن کر اپنی جھولی میں ڈال لیتی ہے۔

شاہد لطیف کی افسانہ نگاری چند سال جاری رہی۔ بمبئی آکر عصمت چغتائی سے شادی کے بعد شاہد لطیف کی تمام تر توجہ فلموں کی طرف چلی گئی۔ جب میں ۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" میں کام کرنے کے لیے بمبئی آیا تو ہم علی گڑھ کے تمام احباب پھر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ہمارے عمل کے دائرے الگ الگ تھے لیکن دوستی کا حلقہ ایک تھا۔

شاہد لطیف جتنے اچھے ادیب تھے اس سے زیادہ اچھے فلمی ڈائرکٹر ثابت ہوئے۔ اُن کا شمار نہایت حساس، لطیف اور ماہر ڈائرکٹروں میں ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اُنھوں نے بہت اچھی اور فنی طور سے خوب صورت فلمیں بنائیں۔ جن میں نو عمر دلیپ کمار، کامنی کوشل، دیوآنند وغیرہ نے کام کیا۔ لیکن جب فلموں کا مذاق بدلا تو شاہد لطیف کی ساری فنی چابکدستی بے کار ثابت ہوئی۔ اس کے بعد بھی اُنھوں نے ایک بہت اچھی فلم "سونے کی چڑیا" بنائی جو اپنی تمام

خوبیوں کے باوجود زیادہ چل نہ سکی فلمی صنعت بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ جس کے سر پر آج تاج رکھتی ہے۔ کل اس کے سر سے تاج اُتار دیتی ہے۔ اب شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کے لئے پریشانی اور ادبار کا دور شروع ہو گیا۔

ایک واقعہ نے شاہد لطیف کو بالکل بے دست و پا کر دیا۔ ایک مارواڑی پروڈیوسر نے شاہد لطیف سے ایک فلم ڈائرکٹ کرائی لیکن جب وہ مکمل ہو گئی تو اس کو ریلیز نہیں کیا۔ اس بازار میں آخری فلم، آخری کام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس فلم کے رُک جانے کی وجہ سے شاہد لطیف نہ تو اپنی کوئی فلم بنا سکے اور نہ اُنھیں کہیں اور کام مل سکا۔ اب مفلسی کا وہ دور آیا جس میں شاہد کو قرض خواہوں سے بچنے کے لئے دیوالیہ ہونا پڑا۔ شہری حقوق چھن گئے۔ ٹیلی فون کٹ گیا۔ آمدنی کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ شاہد نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بھی مفلسی کو ہنس ہنس کر جھیلا تھا۔ لیکن اب ایک گھر اور بیوی بچوں کے ساتھ مفلسی کو جھیلنا آسان کام نہیں تھا۔

برسوں کی تکلیف کے بعد اُمید کی ایک کرن پھر چمکی۔ شاہد لطیف کو گرودت کی ایک فلم مل گئی لیکن قبل اس کے کہ وہ مکمل ہوتی گرودت کا انتقال ہو گیا۔ پوری فلم پھر سے بنانی پڑی اور نتیجہ نقصان اور بے روزگاری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ شاہد لطیف کی فنی خوبیوں کا ہر شخص مداح تھا لیکن کام دینے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔

اس کشمکش کے دور میں شاہد نے بچوں کی ایک فلم بنانا شروع کی اور اپنی ایک بڑی فلم کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن موت نے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دئے۔ شاہد کی پریشانیاں ختم ہو گئیں اور کانٹوں کا تاج عصمت چغتائی کے سر پر آ گیا۔ شاہد کی زندگی میں بھی یہ تاج عصمت کے سر پر تھا لیکن اس وقت دونوں مل کر باری باری اسے پہنتے تھے۔ آج اس کا بار اکیلی عصمت کے سر پر ہے۔ اُردو کی مشہور اور عظیم افسانہ نگار جس کا ثانی برسوں میں پیدا نہ ہو سکے گا اپنے فن کی دولت سمیٹے ہوئے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ تنہا بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن عصمت کا ایک خاندان اور ہے۔ یہ ہم سب کا خاندان ہے۔ بمبئی کے ترقی پسند ادیب۔ ہم آپس میں پیار بھی کرتے ہیں۔ معاصرانہ چشمکیں بھی رکھتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے بھی ہیں لیکن دکھ درد میں ایک ہو جاتے ہیں۔

تبصرے

کُتب موصولہ

موجِ صبا ــــــــ فیض الحسن خیال

روشنی کے پھول ــــــــ اکرام جاوید

عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک ـــ عاشق شاہ

نقش جاوداں ــــــــ پرنس علی نقی خاں ثاقب

(تبصرے کے لئے دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گُلِ نَو از واحد پریمی

ضخامت :- ۱۴۴ صفحات ←←← قیمت :- دو روپے

ملنے کا پتہ :- مکتبۂ صبح ادب نزد مسجد ٹولوالی بھوپال ۱ (ایم - پی)

غزل اردو کی اکیلی صنف سخن ہے جس نے ہیئت و ماہیت دونوں کے اعتبار سے ایک باقاعدہ اور عظیم الشان روایت کو فروغ دیا ہے۔ اس روایت میں ترمیم و تنسیخ تو ممکن ہے لیکن اس سے مکمّل انکار ممکن نہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی وہ غزلیں پڑھنے والوں پر اپنی اہمیت کا نقش بٹھا دیتی ہیں جن میں نئے عہد کے تمام افکار اور گزشتہ روایات کا توازن موجود ہو۔ اس زاویۂ نظر سے واحد پریمی کی غزلوں کے متعدد اشعار نے مجھے متوجہ کیا۔ انھوں نے ریاضت فن کی وہ منزلیں آسانی سے طے کرلی ہیں جن سے بیشتر نوجوان شعراء کی تن آسانی بچ نکلنے کے راستے تلاش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واحد پریمی کے لب و لہجہ میں وہ پختگی ملتی ہے جو غزل کی فنّی روایات کا عطیہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے زندگی اور زمانے کے پس منظر میں انسانی ذہن اور جذبات کو بھی سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا فکری رویّہ منفرد نہیں بلکہ اجتماعی ہے اس لئے کہ بیگانا سے

زیادہ نگارِ زندگی کے عاشق ہیں۔ گردوپیش کی دنیا سے اس محبت نے اُن کی شاعری کو اس سطحیت اور حسیاتی افلاس کا شکار ہونے سے محفوظ رکھا ہے جو بے نام اور مجہول انفرادیت اور لفظی بازی گری سے غیر معمولی شیفتگی کا ردِ عمل ہوتی ہے۔ احساس میں خلوص اور وضاحت ہونے کی وجہ سے واحد پریمی کے اشعار کو زبان بھی سادہ اور پُر اثر ملی ہے۔ اُن کی فکر تک پہنچنے کے لئے ذہن کو کسی ایسے سفر سے نہیں گزرنا پڑتا جس میں قدم قدم پہ رعایتوں کے جال اور ابہام کی پنہائیں ہوں۔ جس شاعر کے یہاں بیک وقت اتنی خوبیاں موجود ہوں اُس کے یہاں اعتماد کی توقع بھی فطری طور پر ہوگی۔ مجھے اُمید ہے کہ واحد پریمی کے اشعار جن امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں ان کا حصول بھی ان کے لئے دشوار نہ ہوگا۔

اس مجموعے پر نظر ڈالتے ہوئے جن اشعار نے مجھے خاص طور سے متوجہ کیا ان میں سے چند یہ ہیں ؎

کبھی نہ حسن و محبت میں نبھ سکی واحد
وہ اپنے ناز میں ہم اپنے بانکپن میں رہے

راہرو چُپ ہیں راہبر خاموش
کیسے گزرے گا یہ سفر خاموش

کوئی ہنگامۂ حیات نہیں
رات خاموش ہے سحر خاموش

کیسی بیمارِ غم کی حالت ہے
کیوں کھڑے ہیں یہ چارہ گر خاموش

زندگی کو کہاں تلاش کریں
کوچہ کوچہ نگر نگر خاموش

بارہا زبانوں پر لگ گئی ہے پابندی
بارہا نگاہوں سے کی ہے گفتگو ہم نے

کیا کوئی دیدہ ور نہیں یارو
چشمِ نرگس ہے کس لئے نمناک

نہ پوچھیے کہ شبِ ہجر ہم پہ کیا گزری
تمام رات جلے شمعِ انجمن کی طرح

مجھے خوشی ہے کہ واحد پریمی کی متعدد غزلوں میں حسنِ خیال اور ریختہ کاری کے ایسے نمونے مل جاتے ہیں۔

شمیم حنفی

میٹرک کے بعد کیا کریں؟

ترتیب و تدوین: لطیف جعفری۔ احمد عثمانی
سرپرست :۔ جناب صادق انصاری

صفحات: ۱۴۴ قیمت دو روپے انصار پبلشنگ ہاؤس انصار ڈابی مشرقی محمد علی روڈ
مالیگاؤں (ناسک)

"انسان کی عظمت اس میں تھوڑے ہی ہے کہ اُس نے فلسفے کی کتنی گتھیاں سُلجھائیں۔ اصل عظمت تو اس میں ہے کہ وہ زندگی گزارنے کا فن کس حد تک حاصل کرتا ہے۔ اپنی زندگی کا راس المال (بنیادی سرمایہ) کیسے فراہم کرتا ہے اور اُسے کس طرح بڑھاتا ہے۔ جسے زندگی بسر کرنا نہ آئے وہ بڑی حقیقتیں کیا جانے؟" —— والٹئر

ہم میں سے بیشتر لوگ محض بیخبری میں زندگی شروع کرتے ہیں اور اندھیرے کا یہ سفر حالات کے ریلے یا محض نقالی میں شروع کرکے اکثر غلط سمت کا رُخ کر کے جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں — یہ کتاب ایسے لوگوں کی بروقت رہنمائی کرکے ایسا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ زندگی میں اپنا صحیح مقام پیدا کر سکیں۔

اس کتاب کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ اُردو زبان میں نوجوانوں اور اُن کے سرپرستوں کی رہنمائی کی یہ کوشش "مہاراشٹر" میں ہوئی ہے۔ اس کتاب سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ "مہاراشٹر" میں اُردو زبان اسکولوں میں جاری ہے۔

علمی و ادبی کتابیں بہت اہم ہوتی ہیں لیکن علم و ادب کی نعمتوں کا ثمرہ یہی ہونا چاہیے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے روشنی فراہم ہو۔ زندگی کے حقیقی مسائل حل کرنے والی ایسی کتابیں بعض اوقات عظیم ادبی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں۔

یہ کتاب مہاراشٹر والوں کے لئے براہِ راست مفید ہے لیکن دوسری ریاستوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ۔

ظہیر

SHAHKAR
Allahabad.
No.53 NOV. 1967